

کتاب

قیمت ۸۰

تضایف نیاز پختی

نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ادبی تعالیات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو کر قیمت علاوہ محصول	گہوارہ تمدن مولانا نیاز کی دو سرگتہ الگ الگ کتاب جس میں تاریخ اور ساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقا میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو کر قیمت علاوہ محصول	شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عظیم النظر افسانہ جو اردو زبان بالکل نئی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضامین و اسکی افشائے سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول	نراست الیہ مولانا نیاز نے پوری جس کے سے ایک شخص باسانی ہاتھ کی ساخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یاد و سرے شخص کے مستقبل سیرت و روح و ذوال ہمت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکیا می وغیرہ کے متعلق جگہ مل نہیں سکتی قیمت علاوہ محصول	شاعر کا انجام جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کا تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور اشارے کے لحاظ سے استعداد بلند چیز ہے کہ دوسری شہرت و نیکیا می وغیرہ کے متعلق جگہ مل نہیں سکتی قیمت علاوہ محصول	جذبات بھاشا جناب نیاز نے ایک دلچسپ تہنید کیساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اور دین سب سے پہلی کتاب شمع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے جیشیل نمونے اس میں نظر آ رہے ہیں قیمت علاوہ محصول
صحایات حسین محمد سادات کی ۵۰ نویسین کی مستند حالات یکجا کر دیے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نے خاص طور پر انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں انصاف سے تعریف فصول ہے اور سے زیادہ صحابیائے حالات کے میں طبعیت کی کتابت نہایت نقص ہے قیمت علاوہ	فتابِ قد چائیکے بعد تین افسانوں کا مجموعہ جنہیں تبا یا گیا ہے کہ ہر دو چیز جو ممکن تھی ہے سونا نہیں زبان و چلاٹ افشا و تخیل کے لحاظ لکھا ہے اس کتاب میں انصاف سے تعریف فصول ہے اور سے زیادہ صحابیائے حالات کے میں طبعیت کی کتابت نہایت نقص ہے قیمت علاوہ	ندا کرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تہنید عالیہ کا عجیب وغریبہ وغیرہ ہے ایک بار اسکو شرع کر دینا آخر تک پڑھ نیسا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں قیمت ۱۲ علاوہ محصول	فلاسفہ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ ہندو گنٹے فلاسفہ قدیم کی دو نمون کے ساتھ ۲۔ ہادیمن کا مذہب ۳۔ حرکت کے گرتے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت ۱۲ علاوہ محصول	تاریخ الدولتین جرجی زیڈان کے تاریخ تمدن الاسلام کی جو تہی جلد کا ترجمہ حسین محمد بنی امیہ وغیرہ کی سیاسیات پر ہمیشہ معرکہ کیا گیا ہے جرجی زیڈان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت معاصل کر چکی ہے قیمت ۱۲ علاوہ محصول	المسلۃ الشرقیہ مصلیٰ کمال پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ دو کتا ہے جس نے یورپ و ایشیا سیاسیات میں محل ڈال دی تھی اور جس نے شہر سے ترکی و مصر عرب و حجاز انقلاب کی روح پھونکی قیمت ۱۲ علاوہ محصول

تذکرہ خندہ گل برایہ جلالہ آبادی کسی جس میں ۳۰۰ مصنفین اسے زائد اور دوفارسی کے طرز میں تراویح کے حالات معائنہ لطائف و طرائف تجاربہ کلام کے درجہ میں قیمت بسیار محمول علیٰ بیعت	دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں مثنوی لالہ رخ طاس میں سر کی معرکہ الہام مثنوی کا مکمل ترجمہ دینی شاہکار کا جمیل نمونہ قیمت منجبت محمول علیہ بیعت	مثنوی نامہ ہر عشق مرتبہ مجنون گور کہ پوری جمیع ملک کے چا بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویریں	خواستہ التحریر طبع یعنی اردو نگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن متقلد اور تمام حالات معلوم کر سکتا ہے اور وہ میں بالکل پہلی کتاب قیمت بسیار محمول علیہ بیعت
---	---	--	--

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے
 رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
 سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صد) ششماہی تین روپیہ ۷۵
 بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۶	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۳۲ء	شمارم
ملاحظات		۲
عہدِ وسطیٰ کے فنون لطیفہ اور اسلام		۹
تمھارا مسلک اور میرا مسلک		۲۰
نغمہ دل	مرزا احسان احمد بی اے، ال، ال بی	۲۳
استدراک جناب دل شاہجہاں پوری	حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہاں پوری	۲۶
موجودہ ترقی فقط ایک دھوکا ہے	محمد عثمان ام۔ اے۔ بی ال۔ وکیل ہزاری باغ	۳۴
تراب شاہ	طالب صفوی	۴۲
مکتوبات نیاز		۴۹
باب المراسلۃ والمناظرۃ		۵۵
باب الاستفسار		۶۶
منظومات	عدم، روش، اختر، بختی، فطرت، شمیم	۷۰

منکار

محرم

اڈیٹر: - نیاز فتحپوری

جلد ۲۶	اکتوبر ۱۹۳۲ء	شمار ۴
--------	--------------	--------

ملاحظات

عورت - تعلیم پر وہ

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ہم نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ظاہر کیا تھا کہ مغربی تعلیم کا اثر ہندوستان کی عورت اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان عورت پر کتنا خراب پڑ رہا ہے، لیکن چونکہ بحث کچھ تشنہ رہ گئی تھی اس لئے آج کی صحبت میں ہم اس کو مکمل کر دینا چاہتے ہیں۔

اس سے قبل ہم نے یہ ظاہر کیا تھا کہ جو نصاب تعلیم اور جو اسلوب تربیت نسوانی مدارس میں رائج ہے اس سے مغربی بیباکی و بے حجابی بلکہ زیادہ صاف الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ بے حیائی و بے شرمی کی تکمیل تو ضرور ہو جاتی

ہے، لیکن آزادی کا وہ جذبہ جو خود داری و صیانتِ نفس کو مستلزم ہے پیدا نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ موجودہ طریقِ تعلیم کا سب سے بڑا نقص ایک اور یہ بھی ہے کہ وہ عورت میں بجا خود نمائی اور ناروازیبائش و آرائش کا احساس پیدا کرتا ہے اور اُس باندی اخلاق کی طرف مائل ہونے کی مہلت ہی نہیں دیتا جس کو اگر عورت سے علیحدہ کر دیا جائے تو وہ اس خوش رنگ پھول سے زیادہ کچھ نہیں رہتی جو صبح کھلتا ہے اور شام تک مرجھا جاتا ہے۔

اس لئے اب بحث طلب امر یہ ہے کہ اگر عورت کو تعلیم دینا ضروری ہے تو وہ کس قسم کی ہونی چاہئے اور نیز یہ کہ کیا پردہ کی موجودہ پابندیاں دور کئے بغیر عورت کوئی ذہنی و دماغی ترقی کر سکتی ہے یا نہیں۔

ہر چند یہ دونوں مسئلے اس قدر پامال و فرسودہ ہیں کہ ان پر بحث کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن چونکہ میری رائے ان مسائل میں ایک حد تک سب سے علیحدہ ہے اس لئے اس کا ظاہر کرنا غالباً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

یہ تو اصولاً میں تعلیم کا موافق اور پردہ کا مخالف ہوں، لیکن موجودہ ترقی یافتہ نسل نے جو ترقی یافتہ نظریے اس باب میں قائم کئے ہیں ان سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ میرے نزدیک ایک عورت کی تعلیم کا یہ معیار کہ وہ انگریزی اچھی لکھ پڑھ سکتی ہے، غزل خوب کہتی ہے یا یہ کہ فسانے اور عشقیہ مضامین لکھنے میں مہارت تامہ رکھتی ہے، اتنا ہی غلط ہے جتنی پردہ کے باب میں یہ سختی کہ اس کو قدرت کی ان تمام نعمتوں سے محروم کر دیا جائے جن سے فائدہ اٹھانا اس کا فطری حق ہے۔ عورت کے لئے تعلیم ضروری ہے لیکن صرف اس حد تک کہ وہ اپنے حقوق مردوں سے حاصل کر سکے اور مردوں کے حقوق ادا کرنے کی اہلیت اس میں پیدا ہو جائے۔ اس کی تعلیم و تربیت کا سنگ بنیاد صرف یہ خیال ہونا چاہئے ہو کہ اگر ملک و وطن کی خدمت کا تمام تر انحصار مردوں پر ہے تو وہ اُن مردوں کی ماں ہے اور اگر کوئی قوم ناکارہ افراد کی وجہ سے فنا ہو سکتی ہے تو بھی اس کی تمام تر ذمہ داری اس کی آغوشِ تربیت پر عاید ہوتی ہے۔ اُس کے حقوق مردوں پر یہ ہیں کہ وہ اپنے اخلاق بندو کرنے کے لئے اُن سے عزم و احترام کا مطالبہ کرے اور مردوں کے حقوق اس پر یہ ہیں کہ وہ اپنے بند اخلاق سے کام لیکر انھیں ملک و قوم کی خدمت کا اہل بنائے۔ دیتا کا یہ نظریہ کہ عورت محبت کئے جانے کے قابل ہے نہایت خطرناک نظریہ ہے اور اسی نے عورت کو اس کے مرتبہ سے گرا دیا۔ صحیح نظریہ صرف یہ ہے کہ عورت عزت و احترام کی چیز ہے اور اگر اس سے محبت کی جاسکتی ہے تو صرف وہی جو احساسِ مجد و شرف کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

مرد عورت کے باہمی تعلق کی بنیاد اگر محض محبت پر رکھی جائے تو یہ صرف جذبات کا کھیل ہوگا اور جذبات بھی وہ جو یکسر انفرادی تشخصاتِ احساس سے وابستہ ہیں اور اجتماعیات سے انھیں کوئی واسطہ نہیں، پھر اول تو یہ جذبات بجائے خود ناپائیدار چیز ہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ ساری عمر کا ساتھ دینے والے ہیں تو بھی

اس سے عورت کا وہ احساسِ مغلوبیت دور نہیں ہو سکتا جو قدرتا ایک مرد کے مقابلہ میں اس کی دلکشی و رعنائی کے انحطاط پذیر ہونے کے احساس سے پیدا ہونا چاہئے۔

سب سے بڑی اور اصولی غلطی یہی ہے کہ مرد و عورت کا مطالعہ اس کی ظاہری ساخت سے شروع کرتا ہے اور اکثر و بیشتر اسی جگہ ختم کر دیتا ہے، در انحالیکہ خود اپنی طرف سے جو چیز پیش کرتا ہے وہ اس کا بطون ہے۔ یعنی اگر وہ کسی عورت کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس کی عوض میں ایک محبت کرنے والا دل پیش کر رہا ہے۔ پھر ایک وقت عورت پر ایسا آتا ہے، جب وہ خود یا مرد کے طرزِ عمل سے مجبور ہو کر یہ سمجھنے پر مجبور ہوتی ہے کہ مرد نے واقعی یہ سودا نہایت گراں قیمت پر طے کیا تھا اور اس احساس کے ساتھ ہی قدرتا اس میں لپتی و مغلوبیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا اثر اس کی اولاد پر پڑنا ناگزیر ہے۔

برخلاف اس کے اگر مرد و عورت کے تعلق کی بنیاد ہی بجائے محبت کے عزت نفس و احترام اخلاق پر قائم ہو تو کبھی یہ عدم توازن پیدا نہیں ہو سکتا اور عورت بھی اس خیال کو سامنے رکھ کر اپنا سر بلند رکھ سکتی ہے کہ مرد نے جو چیز اس سے طلب کی وہ دہی تھی جو خود اس نے دی، یعنی اگر اس نے اپنی مردانہ سیرت کے تمام برکات اس کے سامنے پیش کر دیئے تھے تو عورت نے بھی اپنا حسن نہیں بلکہ اپنی نسائیت اس کے لئے وقف کر دی تھی جو مرد کی بڑی سی بڑی قربانی کی قیمت قرار دی جاسکتی ہے۔

پھر قبل اس کے کہ نسوانی مدارس کی تعلیم و تربیت پر توجہ کی جائے، ضرورت اس امر کی ہے کہ مرد خود اپنی تربیت میں وہ صلاحیت پیدا کرے جو عورت کو صحیح معنی میں عورت بنانے والی ہے اور اس کے دل سے یہ خیال دور کرے کہ وہ کمزور ہے، کم عقل پیدا ہوئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی گھر میں کئی بھائی بہن ہیں تو والدین اکثر و بیشتر لڑکوں کی طرف ذرا کرتے ہیں اور لڑکیوں کو ان کے ہاتھ سے مار کھاتے ہوئے دیکھ کر بجائے برہم ہونے کے خوش ہوتے ہیں۔ لڑکا باہر سے آتا ہے اور اپنی بہن پر حکومت کرتا ہوا آتا ہے، وہ غریب اس خیال سے کہ اگر اس کے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ مار بیٹھے گا اور پھر کوئی اسکی فریاد سننے والا نہیں ہے، طوعاً و کرہاً چاکرانہ اسکی خدمت کے لئے طیار ہو جاتی ہے۔ والدین سمجھتے ہیں کہ اس طرح لڑکی کو گھر کا کام کرنے کی عادت ہوتی ہے، اور اس طرف خیال منتقل نہیں ہوتا کہ جس لڑکی میں ابتداء ہی سے مغلوبیت و مظلومیت کی یہ قیادگی پیدا کی جا رہی ہے وہ جوان ہو کر اپنے شوہر کے مقابلہ میں جذبہ خود داری کیونکہ قائم رکھ سکتی ہے اور اس سے کب یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد میں آزادی کا صحیح جذبہ پیدا کر سکے گی۔ ہندوستانی عورت کی زندگی کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے اخیر تک وہ رونے کڑھنے، خدمت کرنے اور دوسروں کی خاطر اپنے جذبات کا خون کرنے کے لئے

پیدا ہوئی ہے۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی اس کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ چاکرانہ طور پر بھائیوں کی خدمت کرے، گھر کا کام سنبھالے اور جب عقد کے بعد شوہر کے سپرد کی جاتی ہے تو اس حیثیت سے گویا وہ کینز ہے، ادنیٰ خادمہ ہے جس کا فرض سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ مرد کی خوشنودی کے لئے خواہ وہ کتنی ہی ناجائز کیوں نہ ہو اپنے جذبات و احساسات کا خون کرتی رہے۔ یقیناً خدمت بُری چیز نہیں، گھر کا کام کرنا معیوب نہیں، شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری ضروری ہے، لیکن مرآتاً و حسن سلوک کے انداز سے، احساس خود داری و جذبہ غیرت کے ساتھ ساتھ، یعنی اس خیال سے نہیں کہ وہ اسپر مجبور ہے بلکہ اس خیال سے کہ مرد اس باب میں اُس کا محتاج ہے۔ پھر غور کیجئے کہ آج کتنے خاندان ہیں جہاں عورت سے یہ مسادینہ سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کتنے مرد ہیں جو عورت کے جذبات کا لحاظ کر کے اپنے ادب پر کسی قسم کا جبر اختیار کرتے ہوں۔ — انخرض ہندوستان میں عورت کی ہستی کوئی ایسی چیز نہیں جو تکمیل تہذیب و معاشرت میں برابر کا حصہ لینے والی ہے، بلکہ اُس سے بھی منجملہ دیگر اسباب و ذرائع کے ایک ذریعہ و سبب سمجھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسکی اہمیت کیا قائم ہو سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جدید تعلیم نے مغربی عورت کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ مرد کی محکوم رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئی، لیکن چونکہ وہ مرد کے مظالم کو زمانہ نامعلوم سے برداشت کرتی چلی آرہی تھی اس لئے یہ احساس اسکے اندر ایک انتقامی جذبہ پیدا کر رہا ہے اور اب وہ بھی اسی جبر و استبداد سے کام لینا چاہتی ہے جسکی وہ شکار رہ چکی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ ہندوستان میں جہاں عورت کی داستانِ مظلومیت کہیں زیادہ قدیم و دردناک ہے، تعلیم کا اثر اسپر کیا ہو گا اور یہ ردِ عمل جو ناگوار صورت بھی اختیار کرے کم ہے۔ — اس لئے اب ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ عورت کو تعلیم دیجائے یا نہیں، کیونکہ وہ تو ہر حال ہو کر سگی بلکہ غور طلب امر یہ ہے کہ اس سیلاب کیلئے کونسی راہ لہی نکالی جائے جو ہمارے نظام معاشرت کو تباہی سے بچائے۔ مغربی اصولِ تعلیم کے نتائج ہمارے سامنے موجود ہیں اور یورپ کی عورت کی رسواؤں پر بھی ہم سے پوشیدہ نہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نتیجہ وہاں کچھ اور ظاہر ہو، یہاں کچھ اور۔ — علاوہ اس کے اب یہ مسئلہ قیاس و نظریہ کی حد سے گزر کر عمل و نتیجہ کی صورت میں ہمارے سامنے آگیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم نے ہندوستان کی عورت میں کیسی خطرناک ذہنیت پیدا کر دی ہے اسلئے میں اسکا سخت مخالف ہوں کہ اس تجربہ کو جاری رکھا جائے اور صرف اس امید پر زندگی بسر کیجائے کہ ممکن ہے اعلیٰ تعلیم ان نقائص کو دور کر سکے، کیونکہ جس چیز کو اعلیٰ تعلیم کہا جاتا ہے اسنے مردوں کی ذہنیت میں کیا قابلِ فخر تغیر پیدا کیا ہے کہ عورتوں کی اصلاح کی توقع اس سے ہو سکے۔ میری رائے میں لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر کتاب ان کے سامنے مادری زبان میں پیش کیجائے اور ان کے لئے ایک خاص نصاب ایسا مقرر کیا جائے جس میں مذہب و اخلاق کے سوا اور کچھ نہ ہو، لیکن مذہب سے میری مراد وہ اہمہ پرستی نہیں بلکہ وہ نفسیاتی تعلیم ہے جو حسن اخلاق و اصلاح معاشرت کی طرف مایل کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ان کو فرائض خانہ داری اور نسوانی صنائع و ہنر سے بھی آگاہ کرنا ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے وہ اپنے حقیقی فرائض ادا کرنے کی اہل نہیں بن سکتیں۔ علوم و فنون کی طرف زیادہ توجہ

کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ تاریخ و جغرافیہ کے مبادیات اور ریاضی کا اتنا حصہ جو گھر کے حساب کتاب کے لئے ضروری ہے، یقیناً انھیں معلوم ہونا چاہئے۔ انشاء لطیف سے جہاں تک ممکن ہو بچانا چاہئے اور عشقیہ فسانوں کا مطالعہ بھی ان کو ممنوع ہونا چاہئے۔ اگر پانچ سال کی عمر سے لڑکی کی تعلیم شروع کی جائے تو زیادہ سے زیادہ دس سال کی عمر تک یہ تمام مراحل آسانی سے طے ہو سکتے ہیں۔ اسکے بعد یہ غور کرنا چاہئے کہ اس کا دماغ کس طرف مایل ہے اور فطرتاً وہ کس علم و فن کی طرف مایل ہے، اگر اس کا میلان کسی ایسے فن کی طرف ہے جو اس کو گمراہ کر دینے والا ہے تو اس کو دور کرنا چاہئے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمام سہولتیں اسکی تکمیل کے لئے فراہم کرنا ضروری ہیں۔ غیر زبانوں کا مطالعہ لیکن اس حد تک کہ انکی معلومات میں اضافہ ہونا مناسب نہیں اور فنون لطیفہ میں نقاشی ہی ایک ایسی چیز ہے جو عورت کی پاکیزگی جذبات کا ساتھ دینے والی ہے، رہی موسیقی سوا سکی تکمیل کا زمانہ شادی کے بعد آتا ہے اور اسکی ذمہ داری تا مگر اُن کے شوہروں پر عاید ہونی چاہئے۔

یہ درست ہے کہ عورت کی تعلیم میں پردہ کی پابندیاں بڑی حد تک خارج ہوتی ہیں، لیکن پردہ اٹھا دینے کا جو مفہوم آج کل عام طور پر پیش نظر ہے وہ بھی درست نہیں۔ پردہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ عورت کے قواء جسمانی و قواء ذہنی کے نشوونما میں حارج ہوتا ہے، یعنی گھر میں ایک جگہ محصور رہنے کی وجہ سے اسکی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے اور اسکو اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا بھی موقعہ نہیں ملتا، لیکن اگر اس نقصان کی تلافی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ اسکا پردہ توڑ کر مردوں کی سوسائٹی کا آلہ تفریح بنا دیا جائے، تو اس سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ عورت جہن بیماری ہی کی حالت میں فنا ہو جائے۔ اسلامی پردہ اور غیر اسلامی پردہ کی بحث بیکار ہے، دیکھنا یہ ہے کہ زمانہ کا اقتضا کیا ہے اور معاشرتی مصالح کیا چاہتے ہیں۔ سوا اس میں کلام نہیں کہ اگر ایک طرف زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ عورت کا پردہ توڑ دیا جائے تو دوسری طرف ہماری تہذیب معاشرت اس امر کی بھی مقتضی ہے کہ عورت کو بلاک عام نہ بنا دیا جائے اور اس توازن کا قیام تعلیم سے زیادہ تربیت پر منحصر ہے۔ عورت کا پردہ دور کر کے یہ توقع رکھنا کہ وہ جائز حدود سے آگے قدم نہ بڑھائے گی مشکل ہے، کیونکہ آزادی کی لذت کبھی نہ پوری ہونے والی لذت ہے اور اسکی کوئی انتہا مقرر کرنا از بس دشوار ہے، اس لئے قبل اس کے کہ عورت کو اس لذت سے آشنا کیا جائے، اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جانا ضروری ہے کہ وہ خود اپنے مرتبہ و فرائض کو پہچان سکے اور یہ صرف اس تربیت سے پیدا ہو سکتی ہے جو والدین کے گھر میں اسے حاصل ہونے کے لئے اس تعلیم سے جو اسکولوں میں دی جاتی ہے۔ اس لئے مسئلہ تعلیم سے زیادہ اہم سوال تربیت کا ہے اور اسکی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب مرد اپنے طرز عمل میں تبدیلیاں پیدا کریں اور عورت کے اخلاق بلند کرنے کے لئے اس کی دہی عزت کریں جو اس سے چاہی جاتی ہے، ورنہ عورت کو ایک بار آزاد ہو کر مرد سے انتقام لینا ضرور ہے، خواہ وہ اس جذبہ کے ماتحت کتنی ہی ادنیٰ سطح پر کیوں نہ آجائے۔

اردو۔ ہندی

جس طرف دیکھئے اسکولوں میں کالجوں میں "ترقی اردو" کی انجمنیں قائم ہو رہی ہیں اور مادری زبان کی خدمت کا آواز ہر جہاں

سے بلند ہوتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ غالباً اس لئے کہ ہندوؤں نے اُردو سے اپنی بیگانگی کا اظہار کر کے ہندی کی ترقی کو اپنا نصب العین قرار دے لیا ہے۔ بہر حال سبب یہ ہو یا کوئی اور اس جذبہ کے قابل قدر ہونے میں انکار نہیں، بشرط آنکہ یہ کوشش کوئی علمی شکل بھی اختیار کرے اور باہمی نفرت و استکراہ کی کوئی صورت نہ پیدا ہو۔ مگر افسوس ہے کہ اُردو کی ترقی تو اتنی نظر نہیں آتی جتنی ہندو مسلمانوں کی باہمی مغایرت بڑھتی جاتی ہے اور میں اس کو ملک کی حد درجہ بدمصیبتی سمجھتا ہوں۔ اگر مسلمان ہندوؤں سے اس لئے برہم ہوں کہ انھوں نے کیوں ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کو اختیار کیا تو انکی سخت غلطی ہے کیونکہ یہ دور ہندوؤں کے ہنر و تہذیب و بیداری کا ہے اور وہ اپنی ہر چیز کو خاص ملکی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں پھر اُردو جسکی ترکیب میں بڑا عنصر غیر ملکی بلکہ خالص اسلامی زبانوں کا ہے، کیونکہ انکے لئے قابل برداشت ہو سکتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی قدیم روایات تہذیب کو زندہ کرنے کے لئے اُس زبان اور اُس رسم الخط کو استعمال نہ کریں جس میں انکا تمام قدیم تحریر پایا جاتا ہے۔ جسوقت مسلمانوں کی حکومت تھی ہندو فارسی پڑھتے تھے اور ان کی غلامانہ ذہنیت نے اس احساس کو مٹا دیا تھا کہ حکومت کی زبان اختیار کرنا گویا اپنی ملکی و قومی تہذیب کو قربان کر دینا ہے، پھر اب جبکہ مسلمانوں کی حکومت کو مٹے ہوئے ایک زمانہ ہو چکا ہے اور اسکے بعد وہ (ہندو) دوسری نام پھیلنے والی حکومت کو بھی اپنے زیر اثر لاکھتے ہیں، یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے دور غلامی کی کسی یادگار کو قائم رہنے دیں اور اب بھی وہ اُردو کی حمایت کرتے رہیں جس کا ایک ایک لفظ اُن کے گزشتہ دورِ مغلوبیت کی یاد دلانے والا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس تفریق و اختلاف کو مٹانے کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان اُردو سے فارسی و عربی کے ثقیل الفاظ نکال دیں، لیکن میری رائے میں یہ تدبیر کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی، کیونکہ اگر مسلمان اب بجائے فارسی و عربی کے سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنے لگیں تو بھی ہندو اسوقت تک توجہ نہیں کر سکتے جب تک رسم الخط ہندی کا اختیار کیا جائے۔ کیونکہ اُن کے لئے صرف اُردو زبان ہی قابل نفرت و استکراہ نہیں ہے بلکہ اسکا رسم الخط بھی منبغوض ہے کیونکہ وہ عربی کی نقل ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی اُنکے وہ تمام جذبات ہیجان میں آجاتے ہیں جو مذہبی عناد و مخالفت اور اُنکے گزشتہ دورِ محکومیت سے وابستہ ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو سنسکرت سے ملاتے جاتے ہیں یعنی اگر وہ اُردو کو ترک کر چکے ہیں تو اسی کے ساتھ یہی پسند نہیں کرتے کہ مسلمان ان کی زبان کو اختیار کریں۔ بہر حال مسلمان اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہندو پھر اُردو کی طرف مایل ہوں تو یہ خیال محال ہے، اسلئے اب اگر کوئی صورت اُردو کی ترقی کی (بلکہ میں تو بقا کا لفظ استعمال کروں گا) ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ مسلمان ہی اسکی نشر و اشاعت میں حصہ لیں اور جو بوجھ انھوں نے ہندوؤں پر ڈال رکھا تھا اس کو خود ہی اٹھائیں۔ لیکن افسوس ہے کہ جہاں مسلمانوں کی علمی زندگی میں اور بہت سے صفر نظر آتے ہیں، وہیں ایک صفر بھی پایا جاتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ظاہری حیج پکار بھی زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے گی۔ میں نے جو کچھ عرض کیا وہ ممکن ہے بانیانِ انجمن ترقی اُردو کو پسند نہ آئے، لیکن کوئی حقیقت محض اس لئے کہ وہ تلخ ہے چھپائی نہیں جاسکتی۔ وہ فقرات جن کا تعلق دنیائے سعادت یا تصنیف و تالیف سے نہیں ہے اُنکو مسلمانوں کی بے حسی کا صحیح علم نہیں ہو سکتا، لیکن جو چند افراد قہرستانی سے اس مسئلہ میں مبتلا ہیں اُن سے پوچھئے کہ اُردو زبان کس دور سے گزر رہی ہے اور اس کے نام کیو کس طرح زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ہندوستان

میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ کروڑ سے زیادہ ہے، لیکن اُن کے کتنے اخبار کتنے رسائل اس وقت پائے جاتے ہیں اور جو پائے جاتے ہیں وہ کس عالم میں ہیں؟ اس کا بیان حد درجہ دردناک و تکلیف دہ ہے ہندوؤں کا میلان ہندی کی طرف گزشتہ بیس سال کے اندر ہوا ہے، لیکن اسی قلیل مدت میں جو ترقی انکی صحافت نے کی ہے اسکو دیکھ کر حیران رہ جانا پڑتا ہے۔ ہندی کا بد نصیب سے بد نصیب رسالہ کوئی ایسا ہوگا جسکی اشاعت ہزاروں سے کم ہو اور اردو میں بہترین خیاری رسائل کے خریدار سیکڑوں سے متجاوز نہیں ہوتے، ہندی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں ہر سال نکل رہی ہیں اور ایک ادنیٰ شیعہ شائع ہوا نہیں کہ دوسرے اڈیشن کی طیاریاں ہونے لگتی ہیں، لیکن اردو تصانیف کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی کتاب کے دو سال کے اندر بھی ایک ہزار خریدار پیدا ہو جائیں تو سمجھ لیجئے کہ بڑا کمال ہو گیا۔ پھر کیا یہ حیرتناک امر نہیں کہ ایک طرف تو آپ کے احساس کا یہ عالم ہو کہ ہندوؤں کی غلطی کو بھی آپ یہ سمجھتے ہیں گویا آپ کا کوئی حق انھوں نے چھین لیا ہے اور دوسری طرف غیرت عمل کا یہ حال ہو کہ ہندو تو ہندو خود آپکو بھی اپنے فرض کا احساس نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہ لوگ جو اردو کے حامی ہیں، وہ خود کتنی قربانیاں اس حمایت میں کر رہے ہیں، کیا اپنے قلب پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ اردو رسائل و تصانیف کی خریداری پر جتنی رقم صرف کرتے ہیں کیا وہ اس رقم کے دسویں حصہ کے بھی برابر پہنچتی ہے جو سیر و تفریح میں اڑ جاتی ہے اور کیا ان کا انتہائی ذوق علم و ادب اس سے آگے کبھی بڑھا ہے کہ اپنے کسی دوست یا عزیز سے عاریتاً لیکر کسی رسالہ یا تصنیف کو پڑھ لیا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نوع کی انجمنوں کا قیام صرف تفریحی اُپج ہے اور اُس سے بجا نمود و نمائش کے علاوہ کچھ نہیں جو اس زمانہ میں "فیشن" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی اور یونیورسٹیوں کا ذکر نہیں، لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، اور آگرہ کو لیجئے جہاں مسلمان طالب علموں کی تعداد کثرت سے پائی جاتی ہے، کئی لاکھوں میں ایک طالب علم بھی ایسا نہیں جو اردو رسائل یا اردو تصانیف کے مطالعہ کا شوق نہ رکھتا ہو، بلکہ اکثر کا یہ حال ہو کہ وہ اپنی مادری زبان کا مطالعہ تہذیب و سنجیدگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بوظلّات ہندو طلباء کے کہ اگر وہ دن میں آٹھ گھنٹے اپنی کورس کی کتابوں میں صرف کرتے ہیں تو ایک گھنٹہ ہندی رسائل کیلئے بھی نکالتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو انکی اشاعت بڑھے۔ انگریزی داں جماعت کا خیال ہو کہ اردو کے رسائل نہایت ذلیل ہوتے ہیں اور انکا مطالعہ کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اول تو ان کا یہ خیال ہی بھرے سے غلط ہے، کیونکہ قسمتی یا خوش قسمتی سے انکو اردو سمجھنے کا سلیقہ ہی نہیں اور ہو کیونکہ جبکہ وہ ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہوں۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کیلئے اسکو صحیح باز کر لیا جائے تو بھی میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا اس کے ذمہ دار ہائے تعلیم یافتہ افراد نہیں ہیں اور کیا انکا فرض نہیں ہو کہ وہ اپنی زبان کی خدمت کریں۔ لیکن استغفر اللہ! میں گنس سے پوچھتا ہوں؟ اُن سے جو قومیت کے جذبہ سے معرا، اجتماعیت کے اصول سے نا آشنا اور وطنیت کے مفہوم سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ جن کی تہذیب دوسروں سے گدائی کی ہوئی اور جنکی عزت نفس اک جنب گم گشتہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں، ستمبر کو حیدرآباد پہنچا اور آج کہ ستمبر کی ۲۴ ہے یہیں مقیم ہوں یہاں کے خنک و خوشگوار موسم اور جاں بخش و جانفزا سرد ہواؤں میں بھی لکھنؤ کی گرمیاں یاد آ رہی ہیں اور تڑپ رہا ہوں کہ کسی طرح جلد سے جلد پھر اپنے اُسی زادِ یہ خورش میں پہنچ جاؤں جسکی دیرانیاں بھی مجھے عزیز ہیں، لیکن محبت کی زنجیروں کا کیا علاج جو یہاں پہنچ کر میرے پاؤں میں ڈال دی جاتی ہیں بہر حال رہائی کا وعدہ تو کسی کسی طرح حاصل کر لیا ہے لیکن اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں اس اظہار کی ضرورت صرف اسلئے محسوس ہوئی کہ ممکن ہو اس دوران میں بعض احباب کے خطوط کا جواب بروقت نہ دے سکا ہوں، اور وہ اس تعویذ و تاخیر کو بجائے مجبوری کے میری سرکش و بے ادبیاں کر رہا ہوں۔

عہد وسطیٰ کے فنون لطیفہ اور اسلام

فرانسیسی زبان میں (Elice Faure) کی ایک کتاب آرٹ کی تاریخ پر چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جس کا ترجمہ انگریزی میں (Wallace Pach) نے کیا ہے۔ پہلی جلد قدیم آرٹ پر ہے، دوسری عہد وسطیٰ سے متعلق ہے، تیسری میں عہد نہضت سے بحث کی گئی ہے اور چوتھی میں موجودہ دور کا ذکر ہے۔

یہ تصنیف انشاء کی بلندی، جوش تحریر اور نزاکت خیال کے لحاظ سے بجائے خود ایک بے مثل نمونہ آرٹ کا ہے اور اس کے دیکھنے کے بعد مانتا پڑتا ہے کہ ایسی چیز صرف ایک فرانسیسی داغ ہی پیش کر سکتا تھا۔

میں نے اس کتاب کے بعض ابواب کو بیسیوں مرتبہ دیکھا اور ہمیشہ اس نیت سے کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جائے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سارا وقت اس کی لذت انشا میں صرف نہ ہو گیا ہو اور اسے اپنی زبان میں ظاہر کر سکے کی ہمت پیدا ہوئی ہو۔ اس کے خوبصورت و شاندار الفاظ، اس کی نازک ترکیبیں جو فرانسیسی و ترکی انشاء کی خصوصیات میں داخل ہیں، یقیناً کسی اور زبان میں منتقل نہیں ہو سکتیں اور اس لئے اگر میں آج کی صحبت میں اس کے ایک باب کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں تو اس خیال سے نہیں کہ میں اس کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، بلکہ صرف اس لئے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ اہل ہیں وہ اسکا مطالعہ کریں اور اگر اردو میں بھی اس کی انشاء کی تمام خصوصیات کو قائم رکھنا ممکن ہے تو ضرور اس کی کوشش کریں کیونکہ اگر یہ کتاب تمام دکمال اردو میں آجائے تو میں اس کو معجزہ ادب سمجھوں گا۔

اسکی چاروں جلدیں سورویہ میں تھیکر کمپنی بمبئی سے مل سکتی ہیں، لیکن اگر کوئی صاحب یہ صرف برداشت نہ کر سکیں تو مجھ سے عاریتاً لے سکتے ہیں، بشرط آنکہ وہ ترجمہ کرنے کی اہلیت پہنچے مجھ پر ثابت کر دیں۔ نیاز

دو مذہب باہم متقابل ہو جاتے ہیں اور ڈرامہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ اسلام جن خیالات کو مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے پیش کر رہا تھا وہ بالفاظِ تاریخ اُن خیالات سے کہیں زیادہ تھے جنہیں مسیحیت اس وقت تک مشرقی تہذیب کے سامنے پیش کر چکی تھی۔

اسلام، جس نے ایک بے لاگ مذہب کا بدویانہ جوش پیدا کر کے غریب لیکن آزاد عربوں کو کرۂ زمین کی تسخیر پر آمادہ کر دیا تھا۔ وہ اسلام جس کے پیر و خیموں کے سوا کوئی گھر نہ رکھتے تھے اور جن کا منتہائے نظر خواب کی سی لالہائیت دنیا کو اپنے بادِ پاگھوڑوں کی رفتار اور گرد و غبار کا طوفان لے آنے والی ہوا کے ساتھ مسخر کرنا تھا۔ ہاں وہی اسلام عہد وسطیٰ میں اس آرزوئے ناتمام کو لیکر نمودار ہوا جس کے سمجھنے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے اس قدر وہ ہیں عمان مستقبل میں غرق کرتی چلی جاتی ہے۔

جب فرمانروائے روم جسٹی نین نے پایۂ تخت یونان کی درسگاہوں کو بند کر کے ماہرین فنون اور علما کو سلطنت سے نکال دیا۔ تقریباً وہی زمانہ تھا جبکہ گریگوری اعظم نے پلاطینی کتب خانہ جلا کر خاک کر دیا تھا تو وہ ایران کی دولت ساسانی کی ہی آغوش تھی، جس نے ان تمام خانان بر باد یونانیوں کو پناہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یادری قسمت کی بھی بعض عجیب غریب شاندار مثالیں ملتی ہیں۔ جب سرزمین رستم و اسفندیار پر اہل عرب کا استیلا ہوا اور وہ گنج باد آورد کے مالک ہو گئے تو یہی عرب تھے جنہوں نے قدیم تہذیب کے اندر جدید یورپ کی بنیاد ڈالی یعنی جس وقت فضائے مغرب پر ظلمت کی گھٹائیں چھا رہی تھیں اس وقت خلفائے اسلام یونیورسٹیاں کھول رہے تھے۔ نہریں جاری کر رہے تھے، بھجائے عدن کی داغ بیلیں ڈال رہے تھے، مساحت، ریاضی، جغرافیہ و طب کا احیاء کر رہے تھے۔ اور مفتوحہ ممالک کو کاروانسراؤں، مساجد اور محلات کی تعمیر سے آراستہ بنا رہے تھے، گویا ایک تاریک پس منظر میں الف لیلہ کی کوئی داستان طیار کی جا رہی تھی۔

عرب ذہنیت کا حجر العقول کمال یہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی گئی اپنی خصوصیت ہاتھ سے نہیں دی اور باوجود اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا نہ کرنے کے تمام اذہان پر غالب رہی۔ عرب کی یہ ہنگامہ آرا بدویانہ لیکن متحد ذہنیت جو اخلاقی حدود سے بے نیاز اور مادی قیود سے مبرا تھی، محض اسی خصوصیت کے وجہ سے اپنے اور مفتوح اقوام کے خصائص میں ربط پیدا کر کے مغلوب قوموں کو انہیں متحدہ خصائص میں جذب کر لیتی تھی۔ مصر میں قبلی مغربِ قضیٰ اور ہسپانیہ میں بربر ایران میں عجمی اور ہند میں ہندوستانی بنکر اسلام نے نو مسلم قوموں کو اپنی اپنی طبیعت کے موافق اس جوش و خروش کے اظہار سے کبھی باز نہیں کھا جو وہ ان قوموں میں پیدا کر دیتا تھا، الغرض اسلام جہاں کہیں

بھی پہنچا وہ لوگوں کے دلوں کا مالک بن کر رہا۔

جب رسول اللہ کی وفات کے بعد ابو بکر نے اعلان جہاد کیا تو مصر و شام کے فاتحین نے باز نطنی اور قبضہ کنائس میں جو بھی ان کے سامنے آئے اپنے مذہب کے اثرات قائم کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ انھیں اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ پہلے کوئی مقام کتنا مقدس اور کس قدر متبرک تھا۔ وہ جہاں پہنچے مٹائی یا طبع ہو کر پونچے اور کنائس کے در و دیوار پر جو تصاویر نظر آئیں ان پر انھوں نے رنگ بھیر کر قبلہ رخ دیوار میں ایک محراب کھود لی اور اسی جگہ عبادت میں مشغول ہو گئے۔ مصری۔ یونانی یا رومی خرابوں میں جہاں کہیں اُن کو پُرانے ستون یا قلیپائے ملے انھوں نے جمع کر کے سر اور پایہ کا خیال کئے بغیر قطار اندر قطار نصب کر دیا اور اندرونی صحن میں خوارہ کے ارد گرد وضو کے لئے متوازی قطاروں پر مخروطی شکل کی محرابیں قائم کر دیں۔

اس حال پر تین صدیاں گزر جاتی ہیں اور دورِ فتوحات ختم ہو جاتا ہے، یعنی اسلام حدبِ ایران سے کوہستانِ پیری نیزنگ پھیل جاتا ہے اور خانہ بدوش عرب اپنی ولایات مفتوحہ میں جو طاقتیں انہیں سست پڑ گئی تھیں انھیں از سر نو بیدار کرتا ہے۔ اور اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اپنی روح عمل سے مفتوحہ اقوام و ملل کے قوائے عمل میں بیداری پیدا کر دے۔ تمام نخلستان جو افریقہ کے ریگستانوں اور ہسپانیہ میں پھیلے ہوئے تھے، سفید سفید شہروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو کنگورے دار فصلیوں سے محصور ہیں، جلدی جلدی محلات و قصور معہ سایہ دار درختوں کے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ جن کی راحت بخش ٹھنڈ میں آرام و آسائش حاصل کرنے کے لئے ریگزاروں کا سفر کر کے امراء آتے ہیں۔ اور اب جو فوج یا قافلہ ریگ رداں کے بے پایاں سمندر کو عبور کر کے آتا ہے تو اُسے سرابی منظر کے بجائے ایک گلابی یا نیلگوں دھندلکا نظر آتا ہے جس کے ہلکے پردہ میں مکانوں کی کرسیاں۔ محلوں کے پشتے گول ستون اور مینار جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم روح عینِ اسوقت بھی جبکہ وہ بزعم خود اپنی مالک آپ تھی، کبھی اس قابل نہیں ہوتی کہ سراب یا ٹھنڈے سایہ سے زیادہ کسی چیز پر قابض ہو سکے۔ یہ سایہ بھی وہ سایہ تھا جو ایک ساعت کے لئے شعلوں کی دو چادروں کے درمیان جس پر سے فاتحین اسلام گزرے پیدا ہو جاتا تھا۔

جب مسلمانوں کے سیلابِ عظیم کی رو ختم ہو گئی جب وہ آرزوئیں جو ہمیشہ ان کے آگے آگے موج دریا کی طرح چلتی تھیں کسی بھر ذخار یا سلسلہ کوہستان، یا بائزر نطیم کی دیواروں یا فرنگی فوجوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکیں تو انھیں کسی اور راستہ کی تلاش ہوئی، اور چونکہ اب افق بھی مسدود ہو گیا تھا، اس لئے انھوں نے آسمان کی طرقت

سر اٹھایا اور اس طرح وہ بھی بائزرظینی گنبدوں کی صورت میں نمودار ہوئیں اور کبھی مہری محلات کی چھتوں کی شکل میں محلات شاہی کے جلو خانوں کی بھاری بھاری نیم دائرہ محرابیں ٹوٹ چکی تھیں اور ان کی جگہ اوپر کی طرف رخ کرنوالی شکستہ محرابوں نے لے لی تھی۔ اسی طرح گنبد کے دائرہ نے بھی محزوظی صورت اختیار کر لی تھی اس کی وضع قدیم آشوری طرز کی ہو گئی تھی جو قبل اسلام آل ساسان کے ایران میں رائج تھی۔ یہ سب بیضوی وضع کے گنبد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنانے والوں کی آرزو میں ہیں جو فضا میں بلند ہو کر غائب ہو جانا چاہتی ہیں گنبد کے نیچے حصہ کو تنگ کر دیا گیا یہاں تک کہ یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ وہ کہاں سے شروع ہوا ہے۔ اور اس طرح گویا لامحدود کائنات کے معلق ہونے کا راز سمجھ میں آجائے جو دھویں صدی کی ابتداء میں ستون غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ گرجاؤں کی عظیم سادگی کو دیکھ کر ان کے دل میں ریگستان کا تصور پیدا ہوتا تھا اور قدرتا انھیں اس طرف مایل ہو جانا چاہئے تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی گنبد کے ساتھ ساتھ گرجا کی شکل کے بلند مینار بھی قائم ہو گئے جن سے موزونوں کی صدا میں بلند ہوتی ہیں۔ ترکوں نے جن کا ذوق ایرانی ظروف کے نقوش سے زیادہ وابستہ تھا۔ پیچھے ہوئے گنبدوں کی بائزرظینی گولائی قائم رکھی جو خود تو سیاہی مائل سرو کے جھنڈ میں پیچھے ہوئے ہوتے تھے لیکن ان کے بلند مینار فضا میں ابھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ اسی طرح ترک گویا غیر شعوری طور پر بائزرظیم کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کا وارث بن گیا اور اس نے نہ ان رنگین پتھروں کے سلسلہ کو دیکھا جو نور صبح کے ساتھ جگمگا اٹھتے اور ظلمت شب کے ساتھ ماند پڑ جاتے ہیں۔ نہ ان کی نظران طلائی گنبدوں پر پڑی جن کی سطح پر رات ہونے تک آتش شفق کے شعلے کھینٹے رہتے ہیں۔ لیکن ترکوں کو چھوڑ کر تمام مسلم ماہرین فن تعمیر مصر سے لیکر ہسپانیہ تک سر بلند غرفوں اور مہو ترے گنبدوں کی طرف فطرتاً مائل رہے اور جو اظہار ہنرمندی کے لئے گنبدوں کی تقسیم سطحی حصص مساجد کی ترتیب اور متھیاردوں کی وضع قطع بھی بدل دیتے تھے چنانچہ انھیں کبھی گول بناتے تھے کبھی چوکور۔ کبھی ہشت پہلو کبھی صاف اور کبھی ابردار بناتے تھے۔ مہری مساجد البتہ روح صحرا کی طرح ہمیشہ سادہ اور صاف رہیں۔ لیکن مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ کی مساجد میں سیاہ و سفید پتھروں کے بنے ہوئے محراب دار چھتے رائج ہوئے اور گول ستونوں کی بلندی بھی دگنی ہو گئی گویا وہ کھجور کے درخت تھے جن کی جوڑیوں سے ان کے لمبے لمبے پتے نکلتے ہیں۔ قرطبہ کی عالیشان مسجد جو اس زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی جب مسلمان اپنے دین پر سختی کے ساتھ قائم تھے، قریب قریب ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا کوئی گنجان جنگل۔ اس کے سایوں میں بیٹھ کر جو خاموش روشندانوں کی مسلسل قطاروں کے باعث اور بھی زیادہ تاریک ہو گئے ہیں انسان کو خیال گزرتا ہے کہ وہ کسی ایسی ہیبت ناک دنیا میں پہنچ گیا ہے جس کا ادراک محال ہے۔

(۲)

مغرب اقصی کے ماہرین فن تعمیر اپنے محراب دار چھتوں کی وضع قطع میں کافی تفریق پیدا کر دیتے تھے۔ ایک ایوان سے دوسرے ایوان کا منظر، ایک حجرہ سے دوسرے حجرہ کی صورت، شکل، مسجدوں کی تعمیر، قصور شاہی کا نقشہ، باہر گر مختلف ہوا کرتا تھا۔ اُنڈلس کے محلات الحمراء ایسی تعمیریں ہیں جہاں انسان کو سرخ، سنہرے، سیاہ، زمردیں یا فیروزہ ایوان بھی نظر آتے ہیں اور ستونوں پر قائم ہونے والے عظیم الشان دالان بھی اور جہاں آراستہ باغات بھی ہیں اور شفاف مرمر میں حوض بھی۔ ذیروح چیزوں کی تصاویر سے اقصائے مغرب کے ماہرین تعمیرات کا ذہن قطعی خالی تھا لیکن وہ یکسانیت رفع کرنے کیلئے اس امر کی سخت کوشش کرتے تھے کہ خطوط کے اختلاف سے خوبصورتی و دلکشی پیدا کی جائے چنانچہ قوسی محرابوں کے گوشے اندر کی طرف جھکنے لگے اور جھکتے جھکتے محراب کی صورت ایسی ہو گئی جیسے گھوڑے کے نعل۔ پھر محراب کو تنگ کیا گیا اور سامنے کا حصہ کم کر کے اس کے خطوط منحنی کر دئے گئے۔ کناروں پر محراب در محراب بنائی گئی۔ یا شہد کی مکھی کے چھتہ کی طرح چھوٹے چھوٹے خانے بنائے گئے اور حاشیوں پر استرکاری کر کے بیل بوٹوں سے مزین کر دیا گیا۔ جب یہ کام بھی عام ہو گیا تو بچی کاری کا رواج ہوا اور پتھروں کو کھود کھود کر پھول پتیاں نصب کی گئیں۔

جب خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنانے کا کام کمال کو پہنچ گیا تو اس کی دسترس سے مسجد بھی نہ بچیں اور یہاں بھی فرش سے لیکر گنبد کی چوٹی تک نقش و نگار نظر آنے لگے۔ اور عربوں کو کافی فرصت مل گئی کہ وہ اپنے بیل بوٹوں میں نئی ترکیبیں اور نئی نئی باتیں پیدا کرتے۔ پر ہیچ و خم گلاب کی بیلوں۔ مختلف ہندسی شکلوں، خوبصورت کتبوں اور طغروں میں انھوں نے اپنے ذوق آرائش کو صرف کر دیا اور خطوط کے انحناء، اس کی عمودیت اور ہیچ و خم کو اس قدر ترقی دی گئی کہ وہ مربعوں، دائروں، موٹی لکیروں، بیضیوں، شکلوں سے جیومیٹری کی سخت اور صلیح شکلوں تک پہنچ گئے اور وہ چیزیں جو دیوار سے علیحدہ ہوتی تھیں مثلاً منبر وغیرہ ان پر بھی جالیوں اور پر ہیچ و خم خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنائے گئے گویا معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں اور محرابوں کو کسی نے غروں سے آنے والی روشنی کو تقسیم کرنے اور بعض اوقات گنبدوں اور گادوم میناروں کو ڈھانکنے کے لئے مشجر اور چمن کے تھان پھیلادئے ہیں۔ جیومیٹری کی شکلوں کے ذریعہ سے آرائش و زیبائش کا فن خود بخود کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا بلکہ وہ نتیجہ تھا مظاہر قدرت کے مطالعہ کا اور یقیناً اس نے اول اول کوئی نہایت سادہ شکل اختیار کی ہوگی، چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ گلکاری کا کام پھول پتیوں کا گلہ استہ بنانے سے پیدا ہوا۔ جیسا کہ قاہرہ کی

جامع ابن طولوں کی محرابوں کے اطراف میں بنے ہوئے پھول بوٹوں سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ وہ وقت تھا جبکہ فتوحات کے بعد عربوں کا تخیل کسی قدر راحت پسند ہو گیا تھا اور اسے نازک ہونے کی فرصت مل گئی تھی جب دھویں صدی نے اپنا ضابطہ آرائش و زیبائش وضع کیا تو اس وقت تخیل عرب بہت بلند ہو چکی تھی۔ جب لوازم فن آرائش و زیبائش میں کثیر الاضلاع و کثیر الزوایا اشکال کا استعمال رائج ہوا تو عرب جیومیٹری دانوں نے اس امر کی کوشش کی کہ اس سے ایسے عام اصول اخذ کئے جائیں کہ وہ ان اشکال سے عام زیبائش و تزئین کا کام لے سکیں چنانچہ اس وقت سے عربی فن نقاشی ایک صحیح و مستقل فن بن گیا اور اس نے اتنی ترقی کی کہ تصورات ربانی کو بھی انھیں اشکال میں مشکل کر کے دکھا دیا۔

عربی روحانیت ریگستان میں پیدا ہوئی جہاں صرف فضا سے جسیط کی حکومت ہے اور جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انتہا اس لئے انھوں نے بیل بوٹوں میں اتنی ترقی کی کیونکہ ان بیلوں کی بھی نہ کہیں ابتداء ہے نہ انتہا اور ان کو دیکھ کر نگاہ کا کسی ایک جگہ جا کر رک جانا محال ہے۔ یہ بیل بوٹے کیا ہیں گویا عالم ملکوت کی وہ آوازیں ہیں جنکو اول اول ہم کسی اور جگہ سے پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں لیکن جب غور کرتے ہیں تو وہ اپنی ہی آواز معلوم ہوتی ہے۔ فن بھی خود زندگی کی طرح سے اصول ارتقاء کا پابند ہے، اگر تکمیل فن کی خواہش کے بجائے سائنٹفک تحقیق کا ذوق رکھ دیا جائے تو اس کے اندر جدوجہد فنا ہو جائے گی اور اس کا جوش و خروش سرد پڑ جائے گا اگر ریاضیات کو آرٹسٹ کے حلقہ عمل میں داخل کیا جائے گا تو وہ ماہرین فن کے ہاتھوں میں صرف ایسا اوزار بن کر رہے گا جس کا مقصد فن تعمیر کی منطقی حیثیت نمایاں کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر کسی قوم کا فن تعمیر اسے سنگ تراشی یا بت تراشی سے روکتا ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ بے معنی خطوط کا غلام رہیگا اور اس کے اندر کبھی زندگی پیدا نہ ہوگی۔

(۳)

یہ سچ ہے کہ عربوں نے آرٹسٹ کو کبھی مجبور نہیں کیا کہ وہ ذی روح مخلوق کی تصویریں بنانے سے قطعی پرہیز کرے۔ اور بعض اوقات اس قسم کی تصویریں ہسپانیہ اور مراکش کے مساجد و قصور کی دیواروں پر نظر بھی آتی ہیں تاہم تمام موجد قوموں کی طرح جو ریگستانوں میں نہیں قوم عرب بھی فحیات چیزوں کی اشکال و صورتوں سے نفور ہونے میں صرف اپنی جبلت کی متابعت کرتی تھی۔ مذہب جبلت کو صرف دور انحطاط و زوال میں دباتا ہے لیکن جب طاقتیں عروج پر ہوتی ہیں تو جبلت مذہب کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لے جاتی ہے۔ مصر و شام کے فنون اسلامیہ میں

دہی ریگستان کی عریانیت، دہی ریگستان کی اُداسی اور دہی ریگستان کی شان و شوکت پائی جاتی تھی، مغرب اقصیٰ اور ہسپانیہ کے ٹھنڈے حجروں کی گہرائیوں میں خلفاء و حکماء و فلاسفہ کی باتیں سنتے تھے اور جب ان کے فوجی رسالے فتوحات ملکی اور تاخت و تاراج کے بعد واپس آتے تھے تو یہ آکر لیموں کے درختوں کی خوشبو سے متمتع ہوا کرتے تھے۔ اسلامی فن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جہے ہوئے خون میں سونے کی انٹیں رگڑ رگڑ کر اس سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس فن نے مادی دنیا کی تمام موجودات کو حکم دیدیا کہ وہ سیلاب کی طرح چاروں طرف سے اٹھ کر آئے اور اس میں شامل ہو جائے۔ اور ایران میں تو یہ فن گویا ایک خیابان گل دریا حین تھا۔ سرزمین ایران کو مشرقی سواحل بحرہ روم کے ریتے میدانوں یا اُنڈلس و مراکش کی وادیوں سے کوئی مشابہت نہیں جہاں سخت ظلمت اور آگ کے شعلوں میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے۔ جانب غرب ان بالائی علاقوں میں جو وسطی ریگستان کے حدود پر واقع ہیں اور سطح آب سے تین ہزار میٹر بلند ہونے کی وجہ سے گرد و غبار سے بہت دور اور اسی قدر ستاروں سے قریب ہیں، ہوا میں بلور کی سی صفائی پائی جاتی ہے۔ نسیم جانفزا کے جھونکوں میں یہاں کے سفید مرغزار اور گلابی سبزہ زار ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ایسے کچھ نظر آتے ہیں جیسے نم آلود ریشم کے تھان۔ اور فصل بہار سے موسم خزاں تک یہاں کے کشادہ لالہ زاروں اور کھیتوں میں ہلکے سبز رنگ سے لیکر شہرے زرد رنگ تک تمام قسم کے موہوم رنگوں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ آسمانوں میں جہاں کبوتر اڑتے رہتے ہیں اور بادلوں میں وہ تمام ہلکے اور نازک رنگ موجود ہوتے ہیں جو اوائل فصل بہار میں نظر آتے ہیں۔

جب کوئی ان شہروں کے قریب پہنچتا ہے تو وہاں کے بیضوی یا بلند ارکمرخی گنبد۔ اور ان کے بلند مینار جو سرد اور سال کے درختوں میں سے ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عجیب و غریب مناظر پیش کرتے ہیں گویا نیلے، فیروز می، پیاز می، سبز اور زرد رنگوں کو شبنم میں گھول کر افق کی سطح پر تصویریں بنائی گئی ہیں۔ اس نظارہ کا لطف اس آرٹسٹ کو خوب معلوم ہے جس نے براہ کار و ادا صحرا کے نخلستانوں کی سیر کی ہے۔ شکستہ دیواریں، پھٹے ہوئے گنبد اور مینار جن پر سیاہ سفید خطوط کے نقش و نگار محو ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ جو روغن ان پر چڑھایا گیا ہے، وہی قدیم کلدانی روغن ہے جو ایران قدیم نے چین کو بتایا اور جو تاتاری ترک تازوں کے ساتھ پھر ایران میں آگیا۔ یہ البتہ ابھی تک شیشہ کی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہے۔ سنہری گلکاریوں اور سفید کتبوں پر جو مختلف قسم کے پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں ان میں ان نفیسی، نیلے، سفید، لاکھی اور زرد رنگوں کی جھلک عجیب لطف پیدا کرتی ہے روغن مسالہ کی تہ میں جڑے ہوئے دروازوں کی بلند چوٹیوں کے نیچے

فیروزوں، نیلم پاروں اور لاجورد کے مدہم رنگوں کی چمک کے باعث ایک متحرک خط شعاعی دکھائی دیتا ہے اندر کی جانب گنبدوں کی مدور خوشنمائی میں بیل بوٹوں کا جال بچھا کر اس میں ایسے شاخسانے نکالے گئے گویا آویزے لٹک رہے ہیں۔ بعض گنبدوں کے اندر شیشہ کی ایسی لوحیں نصب کی گئی جن سے چاروں طرف کرنیں پھوٹی پڑتی ہیں۔

قدیم زمانہ میں لوگ عجیبی قالین دیواروں پر آویزاں کیا کرتے تھے جو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا قلبہ رانی کرنے کے بعد سیاہی مائل زمین میں سبہ ہائے گل پامال کر دیے گئے ہیں، لیکن سوٹھویں صدی کے آخر میں جب شاہ عباس اعظم صفوی نے اصفہان کی تعمیر کا حکم دیا تو ان قالینوں کی جگہ چکدار روغنی اینٹوں نے لے لی۔ اُس وقت ایران میں جو طبقہ اہل فن کا پیدا ہوا اسے اُن لوگوں کی ہدایات اور مشوروں پر چلنا پڑا جنہوں نے روغنی مساجد کو تمام دولت زینت و زیبائش بخشی تھی۔ تاکہ جہانگیر اور رانی اور خصوصاً بہتراد کے موقوف کی جنبشوں سے اسلامی فن کو غیر معمولی علوئے مرتبت و رفعت حاصل ہو جائے، حرفت کوزہ گراں نے بھی جو دنیا میں سب سے قدیم اور پائدار پیشہ ہے، فن اسلامی کو اپنی طرف سے ضروری حصہ دیا۔ اس کی آراستگی جس میں فیروز کی تصویریں زیادہ نہیں ہوتیں اپنی دلکش نوعیت کے لحاظ سے یقیناً بہت بلند ہے۔ ان ظروف پر گل و ریاحین لہلہاتے ہوتے ہیں، آسمان کی وسعتیں مع اپنے مرداریدی امواج سحاب کے نظر آتی ہیں اور سمندر کی پنہائیاں مع اپنی درخشاں سطح کے منقوش ہوتی ہیں۔ رنگین خطوط، رنگ کے چھینٹوں، پھولوں کے دستوں اور مختلف رنگوں کے اختلاط باہمی سے ایسے ایسے مناظر نقش کئے جاتے ہیں کہ تصور مسحور ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نقاشانِ عجم کا یہ چہستان جس طرح اچانک وجود میں آیا تھا اسی طرح وہ بہت جلد افسردہ ہو گیا کیونکہ اس نے ضرورت سے زیادہ خوشبو اور درخشانی صرف کر دی تھی۔ یہ گویا ایک طلسمی خواب تھا جس کی مختصر سی فرصت میں ہندوستان کے تمام جذباتِ نفسانی، عجم کے تمام سلیقے اور تکلفات، چین کا تمام بطی السیر سائنس اور عرب کے تمام شاندار پرستانی خواب شامل ہو گئے تھے۔

عرب کے ریگستانوں سے لیکر جزائرِ جاپان تک اور مغربِ اقصیٰ سے لیکر ہندوستان تک عجیبی مصوری کے خزانوں کو لئے ہوئے ایرانی نقاشی ایک بحرِ عمیق کے مانند ہے جو تمام خواہشاتِ نفسانی، جملہ کیفیاتِ نشہ و سرور اور قدیم اقوامِ دہلی کی تمام آزاد و موثر خیال آرائیوں کا معجون مرکب ہے۔ وہ ایک باغِ عدن بھتا جہاں پھولوں بھرے مرغزاروں میں شیر پھرتے تھے۔ جہاں سبز سرخ اور نیلگوں ریشمی پوشاکوں میں مرد و عورت

کے نقوش قالینوں پر نظر آتے تھے۔ عجیبوں کے لئے تو جس قدر بھی پھول ہوں اتنے ہی کم ہیں۔ تمام پتوں میں پھول ہیں۔ تمام قالینوں میں پھول ہیں۔ جہاں دیکھو وہاں پھول ہی پھول ہیں۔ بڑے بڑے پھول جن کے نقوش ان کا سہ ماہی جینی میں بھی موجود ہیں جن میں خواتین عجم طلمانی چچوں سے قند و گل کھایا کرتے تھے۔ میدان میں مناظر کی تصاویر میں جہاں سرخ، سبز اور شہرے رنگ ایسی قدرتی ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں کہ فرش تصویر پر نرم فرش محلیں کا گمان ہوتا ہے شوخ و طنانہ خوبصورت راہوار گردنیں خم کئے سر پہ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ہر مرکب پر ایک صاحب فخر و ناز راگب سوار ہے۔ کلائی پر ایک باز ہے اور ایک درختاں طرہ دستار ہوا میں لہرا رہا ہے۔ محلات و قصور کے جلو خانے فرط گل و ریاحین سے مشجر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی روغنیں ابر و دیواروں پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی چھتیاں بلوریں ہیں فرش رنگین قالینوں کا ہے، جہاں طلمانی طائوس اپنی زمر دین د میں پھیلائے ہوئے ہیں۔ باغات ہیں جن میں جگہ جگہ سنگ سماق اور سنگ یشب کے گلے نصب ہیں۔ آب شفاف کے فوارے ہیں جو فضا میں موتی اچھال رہے۔ درجہ بدرجہ پستے ہیں، خیابا نہیں ہیں۔ اور بروج ہیں جن کے رنگ گلابی، آسمانی یا دودھیا ہیں۔ شب کی تاریک گہرائیوں میں بھی یہ ایسے چمکتے ہیں جیسے طلوع آفتاب کے وقت برف۔ جب شام ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طائفہ ارباب نشاط کنار آب بیٹھا ہوا نغمہ و سرود میں مصروف ہے، پختہ پھلوں کی فرحت بخش خوشبوئیں دماغ میں پہنچتی ہیں جو درختوں میں پتوں کے اندر چھپے ہوئے چمکتے ہیں اور نکلتا ہوا چاند تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ستاروں کے ہار سے کوئی سچا موتی ٹوٹ کر گرا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ تمام دلفریب مناظر موئے قلم سے کھینچے گئے ہیں اور ان میں چکدار رنگ بھرے گئے ہیں۔ ان میں تاریک رات کی معصومیت اور دن کی روشنی موجود ہے۔ یہاں الف لیلہ کے تمام وہ قصے موجود ہیں جو داستان گویان پاستانی کے خواب و خیال میں آئے تھے۔ اور جنہیں وہ شام سے صبح تک خیمہ کے نیچے حلقہ جما کر بیٹھے ہوئے خوشمزاج مسافروں کو سنایا کرتے تھے۔

یہاں عجیب و غریب قومیں ہیں جو بحیثیت مجموعی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بعض وہ ہیں جو شہینہ کی سفید عباؤں اور جینوں کے نیچے سرخ و سبز ریشم کی پوشاکیں پہنتے ہیں اور جو اپنے گھوڑوں کے ساز کو زرد جواہر سے مزین کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلحہ بناتے ہیں اور ان میں جواہرات جڑے ہیں۔ وہ ابردار اور نقوش ظریف مسمی میں اپنا پانی رکھتے ہیں۔ ان کو صرف خاموشی و سکوت میں غور و خوض کرنا آتا ہے اور جو کبھی شہنہ پر آتے ہیں تو قہقہوں سے آسمان سر پہ اٹھالیتے ہیں۔ اور جو کبھی کھانے پینے کا دور آتا ہے تو نوشا نوش میں

اپنی فطری متانت و سنجیدگی کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ ان کو نہ موت کی پروا ہے نہ زندگی کی فکر۔ ان کے متناقض و تصور کی بہشت میں حوریں آباد ہیں۔ ان کے شدید جوش مذہبی کا سواے ان کی سخت کاہلی اور جہود کے اور کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وقت ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اور وہ اپنے معابد کو اسی لا پرواہی سے منہدم ہو جانے دیتے ہیں جس قدر جوش و خروش سے انھوں نے ان کو تعمیر کیا تھا۔

موسم کی شدتوں، فطرتوں کے زبردست تضاد اور بدویانہ زندگی نے ان کو توازن روحی سے جس کو ہم اس قدر عزیز رکھتے ہیں بے پرواہ کر دیا ہے۔ دو لہند آدمی سو سو عورتیں رکھ سکتا ہے مفلس و نادار کے پاس چاہے ایک بھی نہ ہو۔ اس طرح گویا نفسیاتی تجربہ اور بدترین بہیمیت کے مابین ایک زبردست فصل ہو جی بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن مغربی قومیں اس خلا کو اس طرح پُر کر لیتی ہیں کہ وہ ان تمام شاہراہوں کو طے کر جاتی ہیں جن پر ہیما نہ زندگی سے آگے بڑھ کر شجاعانہ زندگی کی منزل تک پہنچنا لازم ہے۔ ان مغربی اقوام میں ہکودہ مشرقی قومیں بھی شمار کر لینا چاہئے جو بلحاظ نسل اسی جماعت سے تعلق رکھتی ہیں جس سے یورپین قومیں متعلق ہیں۔

بیشک یہی وجہ ہے کہ ایرانیوں نے جن کے ذہن غالباً اس قدر وسیع نہیں تھے جتنے سامی النسل قوموں کے اپنے تاریخی کارناموں سے کبھی انحراف نہ کیا اور ہمیشہ ارض النہرین کے قدیم تمدنوں کا کچھ نہ کچھ اثر مستقبل میں پیدا کرتے رہے۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ سامانی اور اسلامی ایران کے درمیان فنون عجم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک روحانی مذہب بغیر بت پرستی کے ہی کام چلا سکتا ہے اور بجائے بتوں کو ترقی دینے کے معصوم روح کو ترقی دینا بہتر ہے مگر بت شکن شہنشاہوں کی حمایت میں جو یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر تصاویر کا تعلق مذہب سے نہیں تھا تو فنون لطیفہ کا تو تھا اور وہ ان کو ترقی دیا کرتے تھے۔ بہت کمزور ہے۔ کیونکہ فن کو فن کے لحاظ سے اختیار کرنا چاہئے اور اس کو اس امر کا پابند کرنا کہ وہ ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہو ایسا ہے جیسے تمام سرچشموں کا پانی دفعتاً خشک کر دیا جائے۔

اگر بت پرستی بائبل و تطہیم کو نہیں بچا سکی تو اس کا باعث یہ تھا کہ بائبل و تطہیم شجر یونان کا ایک سڑا ہوا پھل تھا مگر وہ بت پرستی ہی تھی جس نے مصر و یونان اور ہندوستان کو بنادیا، جس نے قوم قوط کے انقلاب سیاسی کی بھیریں کھول دیں۔ اطالیہ اور فلینڈرس میں دور بیداری پیدا کر دیا اور جو یورپ میں تمام گزشتہ صدی کے قابل تعریف اور اہم دور تحقیق و تدقیق کو وجود میں لائی۔ تمام پائدار تمدن بت پرستی ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور یہ مطالبہ ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ انسان ہمیشہ ریگستان میں رہا کرے جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود ریگستان کے لوگ غلستانوں

تمھارا مسلک اور میرا مسلک

تمھارا مسلک ایک آہنی درخت ہے جو اپنی غذا تقلید کی مٹی سے حاصل کرتا ہے اور جس کی شاخیں عادت و استمرار کی قوت سے نشوونما پاتی ہیں۔

میرا مسلک ایک بادل ہے جو فضا میں آزادانہ تیرتا ہے، پانی بن کر برستا ہے، نہر و دریا بن کر سمندر میں مل جاتا ہے اور پھر کھر بن کر ہر طرف چھا جاتا ہے۔

تمھارا مسلک، ایک مضبوط برج ہے جس کو نہ آندھیاں جنبش میں لاسکتی ہیں اور نہ زلزلہ۔ میرا مسلک، ایک نرم و نازک درخت ہے جو ہر طرف جھک جاتا ہے اور جس کی لچک مسرت و سرور پیدا کرتی ہے۔

تمھارا مسلک، تمھارا قدیم مذہب ہے جو نہ تم میں کوئی تغیر پیدا کر سکتا ہے نہ اپنے اندر اور میرا مسلک میری بدعت و اختراع ہے جس کی چھان بین میں ہر صبح و شام کرتا رہتا ہوں۔

تمھارا مسلک یہ ہے کہ تمھارا قوی تمھارے ضعیف کو ہلاک کر دے، تمھارا پُر فن فرد ایک سیدھے سادے شخص کو تباہ و برباد کر دے۔

میرا مسلک یہ ہے کہ میں اپنے کھیت خود کاشت کروں اور خود انھیں کاٹوں، خود اپنا مکان تعمیر کروں اور اپنے کپڑے خود بنوں۔

تمھارا مسلک جاہ و ثروت کا حصول ہے اور میرا مسلک اعتماد و نفس، تمھارا مسلک شہرت و نمائش کی جستجو ہے اور میرا مسلک یہ ہے کہ ان دونوں کو ساحلِ ہمت پر فورہ ریگ سے زیادہ وقعت نہ دوں۔

تمھارا مسلک، سلطنت و ملوکیت کے لئے کوشش کرنا ہے اور میرا مسلک ملک و وطن کے لئے استقلال حریت طلب کرنا۔

تمھارا مسلک یہ ہے کہ رات دن دیا و حریر کا خواب دیکھا کرو اور میرا مسلک صرف روح کی پاکیزگی چاہتا ہے خواہ جسم عریاں ہو۔

تمھارا مسلک یہ ہے کہ بڑے بڑے وظائف و خطابات حاصل کرو اور میرا مسلک قوم کی خدمت کرنا ہے۔

تمھارا مسلک یہ ہے کہ اجتماعی قانون، دینی قاموس، اور سیاسی مطولات مرتب کرتے رہو اور میرا مسلک مبادیات قلب و روح کو پیش کرنا ہے تمھارا مسلک کہتا ہے کہ فلاں عورت جمیل ہے، فلاں قبیح، فلاں فاضل ہو اور فلاں جاہل لیکن میرا مسلک کہتا ہے کہ ”ہر عورت ہر مرد کی ماں ہے، ہر عورت ہر مرد کی بہن ہے اور ہر عورت ہر مرد کی بیٹی۔“

تمھارا مسلک بتاتا ہے کہ ”فلاں چور ہے، مجرم ہے، قاتل ہے، سرکش ہے“ میرا مسلک کہتا ہے کہ ”چور، سرمایہ دار ہی کی پیداوار ہے، مجرم کا خالق خود ظلم ہے قاتل، مقتول کا حلیف ہے، اور سرکشی نتیجہ ہے قدامت پرستی کا“

تمھارا مسلک ”ماہر و فیلسوف کا مستحسب ہے، عالم و فاضل کی جستجو میں مبتلا ہے“ میرا مسلک ”ایک محبت کرنے والے دل، ایک مخلص دماغ اور قربانی کرنے والی ہمتی کا تمنا ہے۔“

تمھارا مسلک کہتا ہے کہ ”فلاں موسوی ہے، فلاں عیسوی، یہ ہندو ہے، وہ مسلمان“ میرا مسلک کہتا ہے کہ ”دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہے، مجرد مطلق۔ اور اسی کی یہ سب شاخیں ہیں جن میں کوئی فرق نہیں“

تمھارا مسلک ”کافر و مشرک، فاسق و زندق، شیعی و خارجی“ کی چھان بین صرف ہے اور میرا مسلک ”ضعیف و کمزور، بیکار و مفلس، مجروح و معذور کی خدمت میں منہمک ہے۔“

تمہارا مسلک غنی و فقیر، آقا و غلام کی تفریق کا حامی ہے اور میرا مسلک بتاتا ہے کہ ہم سب فقیر ہیں اور غنی صرف حیات ہے، ہم سب سایل ہیں اور صاحب عطا ہماری زندگی ہے۔

تمہارا مسلک بتاتا ہے کہ قوموں کی تشکیل سیاسی انجمنوں، سیاسی تقریروں اور سیاسی معاہدات سے ہوتی ہے اور میرے مسلک میں تعمیر قومیت صرف عمل سے ہوتی ہے۔

تمہارا مسلک کہتا ہے کہ ”قوموں کا مجد و شرف اکابر ملوک سے وابستہ ہے اور سکندر و قیصر، ہنی بال و نیولین کا ذکر نہایت فخر کے ساتھ کرتے ہو۔

میرا مسلک کہتا ہے کہ ”اکابر یہ نہیں ہیں بلکہ وہ کنفوشس و بودھ ہیں، افلاطون و سقراط ہیں، غزالی و رومی ہیں“

تمہارا مسلک کہتا ہے کہ قوت نام ہے تیغ و تفنگ کا، ہوائی جہازوں اور بحری اسطولوں کا، بم کا، زہریلی گیس کا۔

میرا مسلک کہتا ہے کہ قوت نام ہے حق و صداقت کا اور تیغ و تفنگ سے غالب آنے والے ایک دن مغلوب ہو کر رہیں گے۔

الغرض تمہارا مسلک اور ہے، میرا مسلک اور !

آئندہ جنوری ۱۹۳۵ء کا نگر

دہلی و لکھنؤ اسکول کی تمام اصناف شاعری پر ایک بے مثل بسیط تبصرہ ہوگا اور یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ اس سے قبل آپ کو نہ کسی رسالہ میں نہ کسی مبسوط تصنیف میں اتنا مفصل تذکرہ دونوں اسکولوں کی شاعری کا کیا نظر آیا ہوگا۔ ضخامت کے متعلق کوئی فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا، کیونکہ تمام مضامین جو معیار پر صحیح اُتریں گے وہ سب کے سب درج کئے جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا حجم سیکڑوں صفحات تک پہنچ جائے۔ اس ایک پرچہ کی قیمت علیحدہ دو روپیہ سے کم نہ ہوگی، اس لئے آپ اپنی خریداری جاری رکھئے تاکہ یہ مجموعہ آپ کو بلا کسی مزید صرف کے مل سکے۔

منیجر نگر لکھنؤ

نغمہ دل

(گزشتہ سے پیوستہ)

لیکن ایک ایک شعر ارباب ذوق کو ترپا دیتا ہے، اس اعجاز و اثر کا حقیقی راز صرف انداز بیان کی جدت و لطافت ہے، غرض شاعرانہ حیثیت سے انداز بیان اور طرز ادا کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اسکو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جناب دل کے کلام میں یہ خصوصیت خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے، جس کا اندازہ ایک بڑی حد تک ان اشعار سے بھی ہوتا ہے، جو ان کے محاسن معنوی کے سلسلہ تنقید میں اوپر نقل ہوئے ہیں، اس موقع پر چند خاص مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک اسیر قفس کی زندگی جس مجبوری اور بیچارگی کے عالم میں گزرتی ہے، اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

افسوس اک اسیر قفس کی تمام عمر وقفِ نظر شناسی صیاد ہو گئی
”نظر شناسی صیاد“ کی ترکیب نے ایک معمولی سے خیال کو جس قدر موثر اور دلکش بنا دیا ہے، اس کو ہر حساب ذوق محسوس کر سکتا ہے۔

ناکا ان زندگی جس طرح بہار کامرانی کی خیالی نقش آرائیوں سے اپنے افسردہ قلوب کو تسکین دیتے رہتے ہیں، اس کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا
محبوب کے دامن جھٹکنے کا انداز کوئی غیر معمولی خیال نہیں، لیکن جناب دل کا پیرایہ بیان قابلِ داد ہے۔
سرطور ایک برقی حسن لہرائی نظر آئی ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے دامن کو

جنابِ دل اکثر تشریح کی بجائے اشاروں سے کام لیتے ہیں جن سے طرزِ ادا میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ ان کا خاص اندازِ معلوم ہوتا ہے مثلاً

بنجو و عشق ہیں دل مائل فریاد نہیں
ہم پہ گزرا تو بہت کچھ ہے مگر یاد نہیں
دیکھو ”بہت کچھ“ کے اشارے نے اور پھر اس پر ”یاد نہیں“ کے ٹکڑے نے جو دلکشی اور اثر پیدا کر دیا ہے
وہ تشریح کی صورت میں ناممکن تھا۔

کہنے کی ہے کیا حاجت احوالِ شبِ فراق
گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا
”تم نے بھی سنا ہوگا“ کے ٹکڑے نے ایک معمولی سی بات میں غور کروا جانِ دلدی ہے، کہا کچھ بھی نہیں
لیکن دراصل سب کچھ کہہ گئے۔

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں
ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں
بجائے ”کیا شے“ کے اگر صاف کہہ دیتے تو شعر کی تمام بلاغت برباد ہو جاتی، ابتدائے محبت کی غیر متعین
کیفیت ”ہائے کیا شے“ نے جس خوبی کے ساتھ ادا کی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اگرچہ جنابِ دل کے اندازِ بیان میں کوئی غیر معمولی جدت اور ندرت موجود نہیں ہے، تاہم اس سے
افکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے طرزِ ادا میں ایک خاص روانی و برجستگی اور صفائی و دلآویزی عام طور پر
محسوس ہوتی ہے، اس کا ایک خاص سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو زبان اختیار کی ہے وہ غزل
کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے، یعنی صاف، شیریں، سادہ اور تصنع و تکلف سے پاک ہے
اگرچہ فارسی کے بھی ذوق آشنا معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس رمز سے واقف تھے کہ غزل کی لطافتِ ثقیل
اور نامانوس فارسی ترکیبوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، چنانچہ بجز ہلکی اور شیریں ترکیبوں کے ان کا کلام اس ثقافت
سے پاک و صاف ہے، لیکن سادگی کے ساتھ ساتھ حتی الوسع شاعرانہ لکینی کا بھی لحاظ رکھتے ہیں، اس کا
اندازہ کافی طور پر اشعارِ مذکورہ بالا سے ہر صاحبِ ذوق باسانی کر سکتا ہے، مزید مثالوں کی چنداں
ضرورت نہیں۔

غزل گو شعرا میں اکثر مسلسل واقعہ نگاری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے، اور یہ اُردو غزل گوئی کا
ایک بڑا نقص ہے کہ باہم اشعار میں کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا، اگرچہ واقعہ نگاری اور تسلسلِ خیال کیلئے
اور اصنافِ سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ وغیرہ موجود ہیں تاہم غزل میں بھی تسلسلِ خیال سے کام لیا جائے تو

بہتر ہے، جناب دل کے کلام میں اکثر عشق و محبت کی مختلف کیفیات کی مسلسل مصوری کی مثالیں نظر آتی ہیں، جن سے ان کی قوت نظم کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً ابتدا سے عشق کی ایک کیفیت مسلسل غزل میں بیان کی ہے، جس کا مطلع یہ ہے:-

یاد ہے اسے ہمیشہ وہ بھی زمانہ یاد ہے دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے
ایک دوسری غزل میں جس کا مطلع یہ ہے
کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ٹھلے تھے اسی خیال میں ہم کر دہیں بدلتے تھے
محبوب کی یاد کی تصویر کھینچی ہے

اس سلسلہ میں وہ غزل جس میں جناب دل نے اپنا نذرانہ خلوص و عقیدت پیک یار کی معرفت بھیجا ہے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے، جس سے ان کے جوش محبت اور گرمی نیاز کا اندازہ ہوتا ہے اس غزل کا مطلع یہ ہے۔

شکیب و ضبط بھی اے پیک یار لیتا جا پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا
افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم ان غزلوں کو مکمل نقل نہیں کر سکتے، ناظرین خود ملاحظہ فرمائیں۔
اس مجموعہ کے آخر میں چند رباعیات اور مخمس ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب دل صرف غزلگو نہیں ہیں، بلکہ اور اصناف سخن پر بھی قادر ہیں، اور اپنے خیالات و جذبات کا اظہار نہایت روانی اور صفائی کے ساتھ مختلف طریقوں سے کر سکتے ہیں، چونکہ ان میں کوئی نمایاں خصوصیت نظر نہیں آتی، اور طوالت کا بھی خوف ہے، اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں، اور جناب دل سے رخصت ہوتے ہوئے اتنا عرض کرنے کی جرات کرتے ہیں کہ باوجود ان کے شاعرانہ فضل و کمال کے، باوجود ان کی متانت اور سنجیدگی کے باوجود ان کی اخلاقی بندھی اور پاکیزہ خیالی کے ان کی لکھنویت اب تک میری نگاہوں میں کھٹکتی ہے، جو ان کے عارض کمال کا ایک بدنما داغ ہے۔

مرزا احسان احمد (بی اے، ال ال بی)

مکتوبات نیاز

رعایتی قیمت میں وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو عارضی بھیدیں کے محض شہی نام لکھا لینا مفید نہیں ہو سکتا۔ پیمرنگار

استدراک جناب دل شاہجہا پوری

نغمہ دل پر جناب نے اپنا قابل قدر وقت صرف کر کے جس فاضلانہ انداز سے ایک بسیط مضمون لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پھر کرم ہائے تو مارا کر دو گستاخ — کو پیش نظر رکھ کر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو حقیقتاً کسی بحث پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف باہمی تبادلہ خیال کی حیثیت رکھتا ہے جناب نے مقدمہ میں حضرت نیاز کے مقدمہ کی بابت تحریر فرمایا ہے کہ "ضرورت سے زیادہ طویل ہے"۔ میرے خیال میں جناب کا مدعا یہ ہے کہ مقدمہ میں صرف شاعر کے کلام یا اس کے حالات سے بحث کرنا چاہئے۔ اور شاعری پر گفتگو کرنا غیر ضروری طوالت ہے اگر واقعی مفہوم یہی ہے تو اکثر دوا دین کے مقدمات نہ صرف طویل بلکہ لا طایل سمجھے جائیں گے اور اس حقیقت سے آپ ہی کو زیادہ واقف ہونا چاہئے۔ پھر جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ غزلیات کی ترتیب قدیم طرز پر ردیف دار رکھی گئی ہے اس ترتیب میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ شاعر کے مدارج کلام کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا یعنی ابتداء میں کلام کیسا تھا رفتہ رفتہ اس میں کیا ترقیاں یا تبدیلیاں ہوئیں، میرے محترم دوست، میں نے اس امتیاز کے لئے حرف ق اور ج لکھنا کافی سمجھا اس صورت میں اہل نظر کے لئے قدیم اور جدید کلام سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ کلام کے ردیف دار نہ ہونے میں یہ زحمت پیش آتی ہے کہ اگر کسی غزل کے دیکھنے کی ضرورت ہو تو کل دیوان کی ورق گردانی ضروری ہو جاتی ہے۔ جناب تحریر فرماتے ہیں کہ "اگر ضخیم دوا دین کے بجائے منتخب کلام کے مختصر مجموعے شائع کئے جائیں تو زیادہ مفید اور بہتر ہو۔" شاعر کا یہ کمال نہیں ہے کہ اس نے کتنا کہا بلکہ کیا کہا اور کیسا کہا، جناب کے خیال سے اس قدر اتفاق مجھ کو ضرور ہے کہ پست اور عامیانا شعرا ضرور خارج کر دئے جانے چاہئیں لیکن شدت کے ساتھ انتخاب مصنف کی قدرت سے باہر ہے ہر شعر مصنف کی عرق ریزی کا نتیجہ ہوتا ہے وہ اپنی

نظر میں اکثر کو بہتر سمجھتا ہے ایسی حالت میں یہ کام اس کے بس کا نہیں اگر کسی دوسرے نقاد کو یہ خدمت سپرد کی جائے تو وہ انتخاب اسی نقاد کے مذاق کا مجموعہ ہو جائے گا ہر سخن سنج کی پسند جدا ہے۔ دور گزشتہ کا ذکر ہے ایک مشاعرہ میں کسی شاعر کے کلام پر جناب غالب ایک شعر کو تین مرتبہ پڑھوا کر داؤ سخن دیتے ہیں جسکیم مومن خاں خاموش ہیں اسی غزل میں جب شاعر دوسرا شعر پڑھتا ہے جناب غالب خاموش ہو جاتے ہیں اور مومن خاں اس شعر کو کئی مرتبہ پڑھوا کر داؤ دیتے ہیں، میرے دیوان پر مدارق میں مولوی عبدالسلام صاحب ندوی، تاج آگرہ میں جناب سیما آب اکبر آبادی اور حمایت اسلام لاہور میں حضرت ریاض خیر آبادی جب اظہار خیال فرماتے ہوئے منتخب اشعار پیش کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر ایک دوسرے کے انتخاب سے مختلف ہوتے ہیں۔ شوق سندیلوی نے اپنی سولہ غزلوں پر ستائیس مشاہیر سے اصلاح لی بعد از اس کو اصلاح سخن کے نام سے چھپوا دیا آپ نے بھی اسے ملاحظہ فرمایا ہوگا، پھر کیا یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ ایک استاد شعر کو قلم زد کر دیتا ہے اور دوسرا اسی شعر پر دو صدا دیتا ہے یہ ہے اختلاف مذاق دنیا، شاعری کا اور یقیناً سخت غلطی ہے کہ دیوان کسی ایک شخص کی رائے پر انتخاب کے بعد طبع کرایا جائے۔ بعض حضرات ایسے ہیں جن کے دل پر سرد انگیز تخیل اثر کرتی ہے، بعض یاس آفریں مضمون کو پسند کرتے ہیں کسی کے لئے نغمہ باعث دلکشی ہے اور کوئی نالہ و زاری پسند کرتا ہے، کہیں رنگ تصوف ہے اور کہیں فلسفہ۔ اگر دیوان صرف یاس آفریں خیالات کا مجموعہ بنا دیا جائے تو شگفتہ طبائع کی نظروں میں وہ کلام مرثیہ ہو جائے گا اور اگر نشاط انگیز کلام انتخاب کیا جائے تو صاحب درد کی نظروں میں بے کیف ہوگا۔ آگے بڑھ کر جناب تحریر فرماتے ہیں کہ ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے جناب دل نے آنکھیں کھولیں تو ملک میں امیر مبنائی کا رنگ چھایا ہوا تھا زانوئے تلمذتہ کیا تو انھیں کے سامنے یہ کیا لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے طبع سلیم عطا ہوئی تھی اس لئے ان کے کلام میں وہ ابتذال نظر نہیں آتا جو عام طور پر لکھنؤ کا انداز ہے۔ تاہم لکھنویت کا اثر بہت کچھ نمایاں ہے نیاز صاحب نے ایک جگہ مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے اور کہیں ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا مبارک لفظ ملے تمام مجموعہ چھان ڈالئے کہیں بھی اس آرام جان تمنا کا ذکر نہ آئے مجھ کو جناب دل کی متانت اور سنجیدگی سے انکار نہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دعویٰ کا مقصد کیا ہے کیا اسکا یہ منشا ہے کہ جناب دل کا کلام لکھنویت سے بالکل پاک ہے، لکھنویت صرف وصل کا نام نہیں جو

مضامین عام طور پر لکھنؤ کے غزل گو شعراء کے سرمایہ خیال ہیں۔ مثلاً شمع تربت۔ چراغ مزار بت سفاک گریہ وزاری۔ ناز و ادا۔ کوچہ قاتل۔ گور غریباں وغیرہ ان کی جھلک جناب دل کے کلام میں بھی نظر آتی ہے اور یہ اثر ان کی قدیم غزلوں میں محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ چند شعر نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:-

”اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں جن کو طوالت کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔“

ہوا سکی گھٹا چھائی چمن میں پھر بہار آئی تمنا ہے کہ وہ گل میری ہن پہنوشیں ہوتا
یہ بھیگی رات یہ ٹھنڈا سماں یہ کیف بہار یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اٹھ کے جانیکا

کیا نیاز صاحب اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہیں کیا پہلے شعر میں آرام جان تمنا کا ذکر نہیں، دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی اگر وصل نہیں تو پھر کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ میری شاعری نے ایک لکھنوی استاد کے آغوش میں تربیت پائی تاہم مجھ کو تغزل میں عریانی اور رنگ ناسخ پسند نہیں آیا ممکن ہے کہ جناب کو وہ رنگ محسوس ہوتا ہو جس کو آپ لکھنوی کہتے ہیں اس امر کا آپ کو خود اعتراف ہے کہ یہ رنگ قدیم غزلوں میں نمایاں ہے۔ منت پذیر ہوں کہ جناب نے مخلصانہ سپراہ میں مجھ کو آگاہ کیا مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ مذکور کے استعمال کو لکھنویت سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے جبکہ شعراء دہلی کے کلام میں بھی بکثرت یہ الفاظ منظوم نظر آتے ہیں۔ نظر اختصار چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اصغر۔	وہ مست ناز جو معجز نمایاں ذکرے	لحد کا پھول چراغ سر مزار نہ ہو
غالب۔	خوشی میں نہاں خو گشتہ لاکھوں زدیں ہیں	چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا
اصغر۔	محو ادا داز ہے یوں ہمہ تن نیاز ہے	پوچھ صنم پرست سے کیفیت ناز عشق
ذوق۔	تھا کوچہ قاتل میں شہادت کا دھینسہ	کھودا جو گنواں گنج شہیداں نکل آیا
”	یارب ہو دلگی خیر کہ کچھ کر رہے ہیں آج	چشم و نگاہ عشوہ و ناز و ادا صلاح
”	میں جو شہید ہوں لب خندان یار کا	کیا کیا چراغ ہنستا ہے میرے مزار کا
”	جن کی نظر چڑھتا ترار خسار آتشیں	اُن کا چراغ گور نہ تاحشر گل ہوا
”	اکی دل لہلوں تو پھر اس بت قاتل کو نہ دوں	جان دوں مال دوں ایمان دوں پر دل نہ دوں
”	نہیں آواز آئے رجم لے ذوق اس سنگر کو	بلاے خوش تو ہوتا ہے وہ میری آہ وزاری سے

میرے اشعار مرقومہ بالا کی بابت اگر جناب یہ تحریر فرماتے کہ سطحی اور پامال ہیں تو ایک حد تک صحیح تھا لیکن شمع تربت چراغ مزار اور کوچہ قاتل کو بالکل لکھنوی چیز سمجھنا درست نہیں۔ فصحاء و بلی کے یہاں بکثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہر لفظ کا استعمال اپنے محل پر متین اور بے محل استعمال ہونے پر خلاف مذاق ہو جاتا ہے، میری رائے میں مجر و مستی اور رقص کا لفظ اردو تغزل میں پسندیدہ نہیں لفظ مستی لغت میں ہوشیاری کے مقابل اور دوسرے مذموم معنی کا حامل ہے اسی طرح رقص کا لفظ اکثر محل پر مطربہ عشوہ گر کی تصویر پیش کر دیتا ہے جب وجد کا متین لفظ موجود ہے تو رقص کا لفظ بے محل کیوں استعمال کیا جائے یہ میرا خیال ہے اگر کوئی صاحب ان الفاظ کے استعمال کو پسند فرماتے ہیں تو ان کی رائے ہے لفظ وصل کے استعمال سے مجھ کو انکار نہیں بشرطیکہ جماع کے مفہوم پر نظم نہ ہو۔ معذور ہوں کہ دنیائے شاعری میں مجھ کو صراحتہ اس مبارک لفظ کے استعمال کا موقع نہیں ملا، میں وصل سے نا آشنا ہوں، ہمیشہ مجبور رہا ہر شاعر کو اپنی بیتی کہنا چاہئے مجھ کو انبساطی مضمون نظم کرنے کا کم موقع ملا اکثر فریاد عاشقانہ جو مرثیہ کی حد تک نہ پہنچے میرا انداز ہے میرے محبوب کی بارگاہ میں رقیب کا بھی گزر نہیں گلہ رقیب سے بھی نا آشنا ہوں میرے دوست نقل فرما کر جناب نے اظہار خیال فرمایا ہے، کہ اگر وصل نہیں تو کس کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ جناب نیاز نے اپنے مقدمہ میں لفظ وصل پر اظہار خیال فرمایا ہے مفہوم وصل کی بابت کوئی تذکرہ نہیں کیا صفحہ پانچ میں جناب نے تحریر فرمایا ہے ”لیکن باوجود اسکے کہ جناب دل کے کلام میں ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے یعنی رقص و سرود اور جوش و مستی کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے جو عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت ہے“ یہ صحیح ہے کہ میرے کلام میں سرور انگیز مضامین کم ہیں لیکن مجبور ہوں کہ میں نے فضاء شاعری میں اکثر نالہ کشی کی کبھی انبساط کا موقع ملا تو حالت وجد طاری ہوئی، رقص سے نا آشنا ہوں اسی طرح خجائے محبت میں بد مستی سے بھی بے خبر ہوں، اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں کہ جناب نے عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت سرور و رقص جوش و مستی کیوں قرار دی ہے عشق کی تعریف ملاحظہ ہو: ”عشق۔ بسیار دوست داشتن چیزے۔ نزد بعض طبایہ مرضیت از قسم جنوں کہ از دیدن صورت حسین پیدا میشود و عبدالرزاق شارح ظہوری از شرح اسباب و فتوحات الحکم نقل کرده است کہ عشق ماخوذ است از عشقہ و آن بناتے ست کہ انرا سیلاب گویند چوں بر درختے چیدان را خشک کند۔ ہمیں حالت عشق است بر سر دے۔ کہ طاری شود جشن راز و دکنڈ۔“ یہ تعریف رقص و سرور کے منافی ہے، اہل لغت کی تعریف سے قطع نظر کیجئے، کامیاب عاشق ضرور رقص و سرور کا

شیدانظر آئے گا اور ہجو پر پیکر غم۔ تغزل صحیح کو جس حد تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ تخیل شاعر مضامین مجاز میں عریاں نظر نہ آئے، محاکات تصوف اور وہ فلسفہ جس کو تغزل برداشت کرے نظم کرنا چاہئے۔ جس رنگ کو جناب نے لکھنوی خیال فرمایا ہے اس کی جانچ کے لئے آئیے دیکھیں تو سہی شعراء دہلی کے کے یہاں بھی مثالیں ملتی ہیں یا نہیں سب سے پہلے خواجہ میر درد کے دیوان پر نظر پڑتی ہے جن کا مذاق شاعری متانت سے لبریز اور ابتذال سے پاک سمجھا جاتا ہے فرماتے ہیں:-

کبود چرخ دیکھا تو سواری کے نہیں قابل
دل اُس مژہ سے رکھو نہ تو چشم راستی
جوں چاہئے اس طرح بیاں ہم سے نہوگا
میرے بھی طرف تو کبھی آ جا مرے دوست
کرے کیا فائدہ ناجیز کو تقلید اچھوں کی
دیکھ کر حال پریشاں عاشقان زار کا
وہ مو کمر کہیں پہ ہوا بے حجاب رات
گو کھینچے کھینچے چلتے جان اپنی شیخ کھوئے
تارنگہ پہ دل یاں دونوں طرف سے دور
اگرچہ دختر رز کے ہے محتسب درپے
اگر مجھے ملے کہو عیب کیا ہے
اے رگ ابرہہ مرگیاں بھی اگر تک برسیں
اگر میں نکتہ رسی سے ترادماں پاؤں
دور ہوں آمادہ میخوارگی یہ مے پرست
دا شد کبھی تو درد کے بھی ساتھ چاہئے
گر سیجا نفسی ہے یہی مطرب تو خیر
جیتا کسی کو چھوڑے نہ یہ گانٹھ زہر کی
لبک آتش کیا کرے یوں قہقہے

مہ نو سے ہے پیدا عیب اسکی بدر کا بی کا
اے بے خبر ہر اسے یہ فرقہ سپاہ کا
کر اپنے دہن ہی سے تو دھت اپنی کمر کا
بڑھیا کی طرح میں بھی خریدار ہوں تیرا
کہ جم جانے سے کچھ اولاد تو گور ہو نہیں سکتا
بانگے معشوقوں نے رہم زلف اب دی ہواٹھا
تھا مثل زلف دل کو عجب پیچ تاب رات
کوئی زندہ دل کرے ہے اس مژہ شوہریت
دونٹ مقابل آئیں جس طرح رسیاں پر
جو ہو سو ہو پر اسے اب تو یار کہتے ہیں
نہ بد وضع تو ہے نہ بد کار میں ہوں
ایک پل میں کئی تالاب تو بھر جاتے ہیں
کمر کو چاہوں تو اسکے تئیں کہاں پاؤں
سر اگر کاٹے انھوں کا محتسب مثل کردو
بند قبا سے کھولے اے گلبدن گرہ
جی ہی جاتے ہیں چلے تیری ہر اک تان سا
زلف سیہ وہ سانپ ہے جکسا ہے من گرہ
چیوٹیوں کے گھر سدا ماتم رہے

شجون کے لئے فلک پھرے ہے
بدنام کرے ہے دخت رز
مشتاق اگر ترا کچھ لکھتے تو کیا عجب ہے
کچھ اور رنج و غم کے سوا سو جھتا نہیں
کیوں تیغ تری دشمنی رکھتی ہو میرے ساتھ
کیا جانے کس کس تیں آہ ڈسیں گی
یا تو وہ راتیں تھیں یا اب یہ دنوں کا پھر ہے
وہ دخت رز کہ چلتی پھرے اک جہان کو
تو چونکا عبث ہے کسی بات کے لئے
وہ نیا وہ فاحشہ ہے کسی سے نہیں بچی
نہیں ہے بے سبب یہ خندہ ونداں ناہرم
ز بس درد جدائی نے ترے بند و نکو ماہر

اب فرمائیے یہ وہی مذاق ہے یا نہیں جس کو آپ لکھنوی مذاق کہتے ہیں اچھا اب جناب ذوق دہلوی کے کلام پر بھی نظر ڈالی جائے جن کے دیوان کا بیشتر حصہ اسی مذاق میں ہے۔ مثلاً لا چند شعر پیش کئے جاتے ہیں

اس نزاکت پر نظر آنا کہ وہ رشک پری
دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرو مہری کا تری
دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اُس مہ پارہ
دیکھتا ہے ذوق ہونگے آج داں لاکھ شجون
ترے جوڑے کے کھلنے نے مرا دل لستان نہا
اس لعل لب کے بوسے لئے ہم نے اس قدر
طفل اشک ایسا گرا داماں مژگاں چھوڑ کر
صید دل کو کیونکہ چھوڑے جبکہ دکھلائے ہو تو
سرخئی پاں دیکھ لے زاہد جو ونداں پر ترے

کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں ہے
منع اس کو نکال اپنے یاں سے
ہوں مثل نرگس آنکھیں پیدا ابھی قلم سے
آتا ہے جبکہ یاد وہ کنج و ہاں مجھے
مجھ کو تو نہیں کام کسی کی بھی کمر سے
زلزلوں نے تو بطرح یہ اب چھوڑے ہیں کالے
ہاتھ اب لگتے نہیں تب پاؤں دبوایا کئے
سنتے ہیں درد پاس بھی اک رات رہی
میں آگیا ہوں صرف ملاقات کے لئے
دیکھا جسے تو اُس کے یہ مردار ساتھ ہے
کسی کے تو لوہو پیئے یہ یعنی دانت رکھتا ہے
اگر آزار بھی ہوتا ہے تو وجہ مفاصل ہے

بال بھی باندھے جو مٹی پر تو زلفِ حور کا
بیشتر ہوتا ہے واں پیدا شجر کا فور کا
میں نے جانا ماہ تاباں پارہ پارہ ہو گیا
پھر جایا اس نے لعل لب پہ لاکھا پان کا
عجب تقدیر نے عقد وہاں کھولا یہاں باندھا
سب اڑ گئی مٹی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد
پھر نہ اٹھا کوہ چاک گریباں چھوڑ کر
مچھلیاں دستِ حنائی میں مری جاں چھوڑ کر
اٹھ کھڑا ہوا ہاتھ سے تسبیح مر جاں چھوڑ کر

تیرے دندان سی زیب کی دیکھی جو بہار
 یہ جتنے سرو ہیں سب اسکے قد پر ہر کھائیں
 تاب و نداں نہ دکھا بزم میں تو نہیں نہیں کر
 کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحاد حسن عشق
 و نہالہ سے سرمہ کے دہواں ہیں تری آنکھیں
 خال سرمہ کا تمھیں چاہئے زیبا لیش کو
 تم مسی ملکر نہ غرہ سے نکالا منہ کرو
 جب دیکھے اسکو تھام کے دل بیٹھ جاؤ تو
 جوں نیچے شاخہ تو نہ چلا انگلیاں طیب
 کھائے داغ آتشیں رخسار سے
 اسے مار رخ روشن کی دکھا تاب مجھے
 کشتہ ہوں میں کس چشم سیہ مست کا یارب
 نہیں مرگاں کی دو صفیں گویا
 لیتے ہیں شب وصل میں ہم اُن کے چومے
 چنی تو نے افشاں جو اے مجھ میں ہے
 آتش خورشید سو دیکھا نہیں اٹھتے دہواں
 نعل شکل مہ نوجب ترے تو سن کو لگے
 بعد مرون بھی خیال چشم قفاں ہی رہا
 تو آنکھ میں نہ سرمہ و نہالہ داروے
 چھلا نہیں تو چھلے کا گل لے نگاروے
 ہزار دم ہیں اسے یاد تو نے دیکھا ذوق
 کرتی ہے زیر برقع فانوس تاک جھانک
 پہنچا تھا شب کند لگا کر دہاں رقیب

اوس سی پر گئی گلشن میں گل سوسن پر
 چمن میں سبز کیونکر ہونہ جائیں سر سے پاؤں تک
 کوئی کھا جائے نہ میرے کی کنی خوب نہیں
 زلف والے شانے پہ لٹکی درمہیاں شانے میں
 کہ بیٹھیں نہ کچھ سیف زباں ہیں تری آنکھیں
 اختر سوختہ ہے اپنا ہی زیبا ہم کو
 اور نہیں گرامنتے۔ تو جاؤ کالا منہ کرو
 جب ناز سے کھڑا ہو وہ رکھ کر کمر پہ ہاتھ
 رکھ رکھ کے نبض عاشق تفتہ جگر پہ ہاتھ
 کم نہیں دل مرغ آتش خوار سے
 چاہئے بہر کفن چادر مہتاب مجھے
 ٹپکے ہے جو مستی مری تربت کے شجر سے
 اک بلا اک بلا سے لڑتی ہے
 وہ لب پہ سحر رنگ مسی کو نہیں پاتے
 ستاروں میں کیا کیا چناں اور چیں ہے
 اکھڑے ہو بام پر تم بال سکھلاتے ہوئے
 چار چاند اور فلک پر مہ روشن کو لگے
 سبز تربت مراد قف غزالاں ہی رہا
 مقتول چشم کو یہیں اک بار باروے
 کچھ تو نشانی اپنی مجھے یادگاروے
 گیا وہ غیر کے گھر تھو کوٹال کے کیسا
 پردانے سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی
 سچ ہے حرام زادے کی رسی دراز ہو

جناب غالب جن کا دیوان فلسفہ عشق اور جذبات سے لبریز ہے اور دھول و دھپ تک پہنچ کر خود ہی پیش دستی کرنے لگے ہیں فرماتے ہیں:—

پنیں پہ گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے
کنڈا بھی کہا روں کو بدلنے نہیں دیتے
مرزا داغ دہلوی کا کلام اکثر عریاں ہے بہ نظر اختصار صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ملے تو رو اسے شباب میں
دور حاضر کے مشاہیر دہلی صرف زبان کے پھیر میں پڑے ہوئے ہیں بکثرت نمونہ کلام اس رنگ میں ہے جسکو جناب ”لکھنوی“ کہتے ہیں بہ نظر طوالت قطع نظر کرتا ہوں اب ہمارے کرم جناب اصغر گوندوی کے کلام پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے اپنے منتخب دیوان میں فرماتے ہیں،

بکھری ہوئی ہوزلف بھی اس چشم مست پر
اس رخ رنگیں سے آنکھیں سینکے
زاہد سادہ لوح کو وہم تھا اشتباہ بھتا
جلوہ رنگیں اتر آیا نگاہ شوق میں
نقش قدم رہیں اسی جان بہار کے
سب مزے کر دئے خورشید قیامت خراب
ہستی غیب سے گہوارہ فطرت
اس دل شوخ و حیلہ جو زیر کمین رنگ و بو
جہاں بھی میری نگاہوں سے ہو چلا معدوم
موج نسیم صبح کے قربان جائے
آئی ہے بوئے زلف معنبر لئے ہوئے

الغرض محض الفاظ لکھنوی ہوتے ہیں نہ دہلوی، بلکہ ان کا محل استعمال لکھنوی و غیر لکھنوی شاعر کی خصوصیت کو ظاہر کر سکتا ہے بشرط آنکہ پہلے یہ امر باور و تسلیم کر لیا جائے کہ لکھنوی میں کوئی جذباتی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا اور دہلی میں سوائے حقیقی عشق کرنے والوں کے کسی اور نے شاعری کی ہی نہیں ورنہ یونہی جس طرح ابتذال امیر و میرزا کا کلام خالی نہیں بالکل اسی طرح ناسخ و پیروان ناسخ کے یہاں بھی صحیح عاشقانہ جذبات مل سکتے ہیں۔

حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہا پوری

موجودہ ترقی فقط ایک دھوکا ہے

افسوس ہے، کہ خوش اعتقاد لوگ، موجودہ زمانہ کی ”ترقی“ موہوم“ سے مرعوب ہو کر، انسان کی موجودہ ترقی کا صحیح اندازہ لگانے سے بالکل قاصر ہیں۔ علم تمدن کا ہر ماہر، نہایت آسانی سے قطعی طور پر یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مسئلہ ارتقاء (Evolution) کو نظر انداز کر بھی دیا جائے، تو صرف بہتر غذا، اچھا یا حول، اور عمدہ تعلیم و تربیت کی بناء پر، انسان کی موجودہ حالت بہت کچھ سدھاری جاسکتی ہے۔ وہ اپنی مدلل گفتگو سے تمہیں اس بات کے ماننے پر مجبور کر دے گا کہ ”افراط و تفریط“ ”سرمایہ داری“ اور ”مزدوری“ کے جھگڑوں کی وجہ سے صرف ایک ناقص اقتصادی اصول ہے۔ وہ تم سے یہ بھی منوا چھوڑے گا کہ انسان باوجود ”قصور وار“ ہونے کے موجودہ زمانہ کی ”منظم بے ترتیبی“ (Ordered Disorder) سے اسی درجہ بری الذمہ ہے جس قدر ایک پتنگا (جو غیر ارادی طور سے شمع پر جل مرتا ہو) الزام خود کشی سے وہ، بطور مشاہدہ، بین طریقہ سے تمہیں دکھائے گا کہ ایک بازیگر کی توانائی اور حیاتی اور ایک مفلوج شخص کی خمیدہ پیٹھ میں جو فرق ہے وہ مشروط ہے، نہ کہ فطری۔ اس کے علاوہ، علم معاشرت کا ماہر یہ بھی ثابت کر دکھائے گا کہ انسان کی مذموم ترین خصلت اور ناپسندیدہ ترین حرکت ”طبعِ زاد“ یا جلتی ”نہیں، بلکہ وہ۔ نتائج ہیں اُن ”مدافعانہ حملوں“ کے جو ہماری ”خود ساختہ سماجی پابندیاں“ ہمارے فطری اوصاف پر کرتی رہتی ہیں۔

وہ شخص جو ”انقلاب پسند“ ہو، یا وہ شخص جو کھلے میدان میں لڑنے سے احتراز کرتا ہو، یا وہ شخص جو، خواہ مخواہ تلوار کے زور سے مذہب پھیلانے پر تلا ہوا ہو، یا وہ شخص جو گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہو اور ہمیشہ نباتات ہی پر گزار کرتا ہو، — ڈاکٹر ہو یا وکیل، پادری ہو یا اصول اخلاقیات کا معلم، ورزش میں طاق ہو یا سپاہی ہو، شکاری ہو، یا موجد، سیاست داں ہو یا... کوئی بھی ہو، — سب کے سب ایک آدھ نسخہ انسان کی ترقی و بہبودی کے لئے پیش کرتے ہیں، اور تقریباً ان لوگوں کی ہر مجوزہ اصلاح، دائرہ امکان کے اندر ہی

ہوتی ہے۔ اور ایک نہ ایک بُرائی کی بیخ کنی ہی کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن ان لوگوں کے نظریہ کے مطابق ”ترقی“ کا معیار ہر مجوزہ اصلاح کا عملی طور پر پورا ہو جانا، اور ہر فرد بشر کا ”دماغی“ اور ”جسمانی“ ترقی کے اُس بلند ترین کنگرہ پر پہنچ جانا ہے، جس پر بہت ہی تھوڑے لوگ اب تک بدقت تمام پہنچ سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں ”ایک مصلح کے“ ”تگ و دو“ کے لئے ایک وسیع اور لق و دق میدان نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے لئے بہت سی عظیم الشان منازل مقصود ہیں، جن کی دشوار گزار گھاٹیوں کے عبور کرنے کا شوق ہر اولوالعزم شخص کے دل میں موجزن ہے۔ اور اسی لئے انسان کے واسطے ترقی کا ہر دروازہ کھلا ہوا ہے! — لیکن افسوس ہے کہ موجودہ انسانی نسل کا کوئی فرد بھی بام ترقی کے اُن سر بفلک چوٹیوں (جن کی جانب وہ روز ازل سے للچائی نگاہوں سے دیکھتا رہا ہے) کے گرد پا کو بھی نہ پاسکا!

تاہم، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ”اگر“ ہم سب کے سب کمر ہمت باندھ کر اول الذکر مصلح کے بتائے ہوئے راستے کو شروع سے آخر تک طے کر لیں، تو یقیناً دنیا ترقی کے میدان میں بہت دور نکل جائے گی۔۔۔۔۔ لیکن نہ تو یہ ”اگر“ امید افزا معلوم ہوتا ہے،۔۔۔۔۔ نہ ”وہ اگر“ کہ ”اگر آسمان گر پڑے تو چڑیاں پکڑ لوں!“ سچ تو یہ ہے کہ انسان اُس بتائے ہوئے دشوار گزار راستے پر کبھی گامزن نہ ہوگا، اس کی ہمت اور قوت ارادی، اس کام کے لئے ناکافی ہے، اور وہ صحیح معنی میں ان مقاصد کے پورے ہونے کا سچے دل سے متمنی بھی نہیں ہے کیونکہ ہماری تمنائیں اکثر و بیشتر ”سطحی خواہش سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔“

تم اگر کسی سے یہ پوچھو کہ ”کیا تو بہتر انسان بننا چاہتا ہے؟“ تو وہ نہایت دیانتداری سے جواب میں ”ہاں“ کہیگا۔ یا تم اگر کسی سے یہ پوچھو کہ ”تم ایک لاکھ روپیہ لو گے؟“ تو وہ بھی بصد آرزو ”ہاں“ کہیگا۔ لیکن وہ دیانت دار انسان، جو ایک ”بہتر انسان“ بننا چاہتا ہے، اپنے سابق طرزِ عمل کی لکیریں اب تک پٹیا نظر آتا ہے! اور وہ آوارہ گرد جو ایک لاکھ روپیہ کی تمنا رکھتا ہے، دس شلنگ بھی کمانے کی زحمت گوارا کرنا پسند نہیں کرتا! یہی وجہ ہے کہ بیشتر لوگ، جو تمام عمر لاکھوں روپیہ کی وراثت کے لمبانے کی امید پر زندگی کی گھڑیاں گنتے رہے، جب مرے تو اس طرح کہ کبھی پانچ پانچ روپیہ بھی بیک وقت ان کے پاس جمع نہ ہو سکا۔ اس سے انکار نہیں کہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ اکثر فقیر پھٹے پرانے اور بوسیدہ گودڑیوں میں دم توڑتے ہیں، لیکن ان کی جھولیاں اشرفیوں سے پُر ہوتی ہیں،۔۔۔۔۔ جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اُن کی خواہش روپیہ کے جمع کرنے کی اس قدر زبردست ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب رہتے ہیں۔

علم اقتصادیات کا ماہر جانتا ہے کہ جب تک کسی چیز کی مانگ نہ ہو، اس کا مہیا ہونا ناممکن ہے۔ اور یہ مقولہ سیاست، اخلاقیات اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے صادق آتا ہے۔ کسی چیز کا فراہم ہو جانا ”طلب صادق“ پر منحصر ہے۔ اس لئے محض تمناؤں کے ہجوم اور زبانی جمع خرچ سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کسی قوم یا فرقہ نے اب تک تربیت گاہ تمدن کی ابتدائی تعلیم اور تشکیل سے باہر قدم نہیں نکالا ہے..... اور اس معمولی سی ترقی کے مدایج بھی، کسی ”جذبہ رفاه عام“ کے ماتحت نہیں، بلکہ تعصبات ضد، اور وحشت بربریت کے ذریعہ سے طے ہوئے ہیں۔ انگلستان کے ۱۸۳۲ء کے ریفارم بل کو دیکھو..... کیا یہ اس امر کی تشریح نہیں کرتا کہ دو تعلیمی جماعت، ایک ایسے سیاسی اصلاح کے نافذ کئے جانے پر جس کی ضرورت بین اور ناگزیر ہو، آپس میں لڑیں اور یہ مسودہ قانون اس وقت تک ”قانون“ بنکر نافذ نہ کیا جاسکا، جب تک برمنگھم کے ”شرفاء“ نے سینٹ جیمس کے مذہبی حلقہ کے ”شرفاء“ کا فوجی ساز و باز کے ساتھ گلا گھونٹنے کا انتظام نہ کر لیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا نفاذ اب تک نہ ہوا ہوتا اگر اس کے ”مفاد“ کے منطقی بحث و مباحثہ کے علاوہ، ”د طاقت“ اور ”زور“ سے کام نہ لیا گیا ہوتا..... ملکہ الیزبتھ کی طرح ہوش گوش رکھنے والا خود مختار اور مطلق العنان حکمران کالج کے اُن سن رسیدہ طلباء کی جماعت کثیر کی بہ نسبت (جو ۱۸۸۴ء کے قبل تک اپنے ”قدیمی استحقاق“ کی بنا پر حکومت کرتے چلے آتے تھے، اور جو ۱۸۸۴ء کے بعد سے، جب ”حق رائے زنی“ ہر بالغ شخص کو عطا ہوا کبھی بہتر طریقہ سے حکومت کرتا۔

موجودہ زمانہ میں اُن فلسفیوں کی جگہ، جو ہر فعل کی اصلیت اور خوبی و برائی کے افادی نقطہ نظر سے جانچتے تھے، نے *Falsch* نے لے لی ہے۔ اس سوسائٹی کے شایستہ باضابطہ اور سکون پسند طریق عمل کے قابل قبول ہو جانے کا واحد ذریعہ بس یہی ہے کہ ہر فرد بشر اس کے اصول پر ٹھنڈھے دل سے غور کرے سمجھے اور بے چون و چرا قبول کرے۔ لیکن آج (۱۹۳۲ء) کا نام اُنھیں مقامات میں جہاں آج سے تینس برس پہلے لفظ ”ضامنہ“ (Falsch) ”قاتل“ اور ”فتنہ پرور“ کے مرادف سمجھا جاتا تھا، کیوں اس قدر عزت سے لیا جاتا ہو؟ اس لئے نہیں کہ دنیا کی سرمایہ دار حکومتوں کو اس سوسائٹی کے ”حسن تدبیر“ پر غور و خوض کرنے کا اور عمل پیرا ہونیکا ذرہ برابر بھی خیال ہو..... بلکہ اس لئے کہ انھوں نے اپنے ”طریقہ عمل“ سے تشدد، تہدید اور استبداد کے عناصر کو نکال کر، مفلس اور قلاش عوام الناس کی ”انقلاب پسند جماعت“ کی صدائے احتجاج کا صرف قلع قمع ہی نہیں کر دیا بلکہ موجودہ نظام حکومت، اور طرز تمدن کو اس واحد خطرے سے، جس سے وہ حقیقتاً خائف تھے بالکل ہٹ کر بنا دیا!

بلاشبہ اگر اقوام عالم آج بھی *Faama* کے طریق عمل پر کاربند ہو جائیں تو اس کی پابندی اتنی ہی سختی کے ساتھ برتی جائے گی جس طرح موجودہ زمانہ میں قوانین ملکیت کی اور *Faama* کا اصول عمل قانون کی حیثیت اختیار کر لیا اور اس کے مخالفین یا تو جرمانہ دینے پر مجبور کئے جائیں گے، یا کھڑے کھڑے فروخت کر دئے جائیں گے، یا بالآخر انھیں جس طرح موجودہ قوانین کی عدول حکمی پر سزا ملتی ہے۔ پھانسی دیدی جائے گی۔

لیکن سر دست سرمایہ دار طبقہ *Faama* کے ان اصول کو قوانین کی اہمیت حاصل کرتے ہوئے نہ دیکھ کر..... ان سے خائف نہیں ہے۔ لیکن برخلاف اس کے یہ طبقہ غارتگروں اور قاتلوں کی خفیہ سازشوں سے ڈرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ یہ طبقہ حتی الامکان اس حقیقت کو طشت از بام ہونے نہیں دیتا کہ بالآخر ان ذرائع میں جو یہ (یعنی سرمایہ دار طبقہ) حقوق ملکیت (Proprietary rights) کے استحفاظ کے لئے استعمال کرتا ہے اور ان ذرائع میں جو ایک بم انداز (Bomb Thrower) اپنے ذاتی خیال کے مطابق انسان کے فطری اور پیدائشی حقوق کے استحفاظ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ جہاں تک اخلاقی فرائض کا سوال درپیش ہے۔ کچھ بھی فرق نہیں۔

سرمایہ دار حکومت (Falan Society) کی پیٹھ "شاہاش" کہہ کر ٹھوکتی ہے۔ برخلاف اس کے مساوات عامہ کا علمبردار (Mandate) جو کھلے الفاظ میں یہ کہہ دیتا ہے کہ مساوات عامہ کے حاصل کرنے کے لئے وہ انقلاب چاہئے جس میں "انقلاب پسند" جماعت مخالف جماعت کو جو ڈرانے، دھمکانے اور مارنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتی گمراہ کن تصور کیا جاتا ہے۔ اور اُس کو قید سخت اور محنت شاقہ کی سزا شاید اس غص سے دی جاتی ہے کہ سرمایہ دار حکومتوں کی "عدم تشددانہ نترانیوں" کے پول کھل جائیں اور ان قیدیوں کو معلوم ہو جائے کہ سرمایہ دار حکومتیں یوں لاکھ عدم تشدد کا سبق اپنی زبان سے پڑا کریں، اور دوسروں کو حفظ کردانے کی کوشش کیا کریں، لیکن جب کبھی ان کے نام و نمود کو ایک الکی سی ٹھیس بھی لگ جائے یا لگ جانے کا اندیشہ ہو، تو یہ (یعنی سرمایہ دار حکومتیں) فوراً "عدم تشدد" کے ازبر سبق کو دفتر پارینہ کا کرم خوردہ باب سمجھ کر صاف بھول جاتی ہیں اور پھر "تشدد" و "استبداد" کے حربوں سے کام لینے لگتی ہیں۔

تو کیا ہم "صلح جو" اور "سکون پسند" ذرائع کے توسل سے نسل انسانی کی ترقی کا خیال اٹھا دیں؟ اور "بم اندازی" اور "خفیہ سازشوں" پر اتر آئیں؟ نہیں۔ یہ دونوں طریقے بیکار ہیں۔

لیکن، غالباً ہم انداز کا یہ کہنا حق بجانب ہو گا ”کیا تم نے ابھی ابھی اس کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ کوئی چیز بغیر لاکھی کے زور کے نہیں حاصل ہوتی؟ کیا (Gladstone) کو تسلیم نہ کرنا پڑا تھا کہ (British Church) کی مخالفت توپ سے سر کی گئی نہ کہ غیر متعصبانہ جذبات (Liberalism) کے اثر سے؟

ہم کو ان سوالات کا جواب بیوقوفی اور بزدلی سے، ”نفی“ میں نہیں دینا چاہئے..... حقیقتاً ”ہم انداز“ کے قول کا مجھے اعتراف ہے.... بلکہ یہ کہنا بھی صحیح ہو گا کہ فطرت انسانی کا تقاضا یہی ہے کہ اگر کسی مساوات عامہ کے سب سے زبردست حامی کے پاس کچھ اپنی ذاتی جائداد ہو تو اس کا طرز عمل بھی قدیم زمینداروں سے — ہرگز جداگانہ نہ ہو گا۔

غور سے دیکھا جائے تو پارلیمنٹ میں، ”مخالفین کی صف بندی“ کو ”جنگ“ پر صرف اسی قدر امتیاز حاصل ہے، جتنا ایک ایسی فوج کو (جو بغیر لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دے) Waterloo اور

Trafalgar پر! — میں ان مندرجہ بالا ”اعترافات حقیقت“ کا ہدیہ

(۱) ان (Finians) کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنہوں نے سادہ لوح آئر لینڈ کے باشندوں سے — جو ان کے مظالم سے تنگ آکر امریکہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے — اس غرض سے روپیہ وصول کیا کہ انہیں کے پس ماندہ رشتہ داروں پر وئیزان کے سیاسی و مذہبی عقائد پر آئر لینڈ پہنچ کر حملہ کیا جائے۔ (۲) وئیزان خفیہ پولیس حضرات کی خدمت میں جو سیدھے سادھے کم عمر مزدوروں کو ہکا بکا کر پاس ہی کے کسی لوہار کی دوکان سے ”ہم“ لانے کو کہتے ہیں، اور بعد وہ اُنہیں گرفتار کر کے سزائے دائم الجبس دلاتے ہیں۔

(۳) وئیزان بری، اور بحری سپہ سالاران فوج کی خدمت میں جو دشمنوں کے شرائط اور پیام صلح کو ٹھکرا کر ایک آخری ”ناقابل قبول شرط“ کے تحت جنگ (Ultima Ratio) پیش کر کے گولہ اور بارود کے منہ پر سانے لگتے ہیں۔

لیکن کیا فائدہ کہ انسان بجائے ”نرمی“ اور ”انسانیت“ کے ”سختی“ اور بجائے ”غور و خوض“ کے ”جلد بازی“ اور ”ناعاقبت اندیشی“ سے کام لے؟ کیا آج انگلینڈ آئر لینڈ کے قلعوں کے مسمار کردئے جانے سے بہتر حالت میں ہے؟ یا کیا اس خیال کی ذرا سی بھی گنجائش ہے کہ ایک ایسی قوم کو جو بھڑکریوں کی طرح

مظالم برداشت نہ کرے اور بعدہ چند ایسے مستقل مزاج مصلحین کی سرکردگی میں اُن تینوں اول الذکر اشخاص کے سروں کو قلم کر دے اس انقلاب سے کچھ بھی فائدہ ہوا ہوگا۔

فرض کرو کہ (Gun powder) کا میاب ہوتا اور (Faukes) کا خاندان ہمیشہ کیلئے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہو جاتا تو کیا اس رد و بدل سے انگلستان کی موجودہ قومی یا انفرادی حالت میں ذرہ برابر بھی فرق ہوتا؟ نہیں۔

فرانس میں ”مجرموں“ کے سر کاٹنے کی مشینوں (Guillotine) کا استعمال انسانی تحمل اور برداشت کی حد سے زیادہ کیا گیا۔ اس لئے اگر (Marie antoinette Fonguier) کی طرح اپنے قاتلوں سے یہ پوچھتی کہ ”کیا میرا سر قلم کرنے سے تمہیں روٹیاں سستے داموں ملیں گی؟“ تو اس کا یہ سوال ہرگز بے محل نہ ہوتا..... فرانس کو اس خونریزی سے کیا ملا؟ امریکہ ہی کی طرف دیکھو! یہ مانا کہ وہاں تو (Mad Chamber) ہے، اور نہ ایسے جاگیردار ہیں جنہیں جاگیریں بشرط خدمات جنگ دی گئی ہوں۔ مگر امریکہ میں لکھتی اور کر دیتی ہیں جن کے کارخانجات برقی تار اور مسلح نوکروں سے گھرے ہوئے ہیں۔ کیا امریکہ کی ”جنگ آزادی“ کے اُن نتائج کو جو آج ظہور میں آرہے ہیں اگر (Washington) اور (Franklin) قبل سے جانتے ہوتے تو کیا وہ اس کی حمایت کرتے؟ ہرگز نہیں۔

جو کام کرا مول، قیصر اور نپولین اپنے زبردست شاہی اقتدار اور رعب داب کے باوجود نہ کر سکے وہ چند جوشیلے اور تلون مزاج جبرائیم پیشہ ہرگز نہیں کر سکتے۔

ایک گمراہ، اور بد باطن یہودی بھی — جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے اب تک لوگوں کو بغاوت پر خفیہ طور سے ابھارتا رہا ہو — یہ تسلیم کرنے میں شاید پس و پیش نہ کرے گا کہ کتنا اپنی قے کی ہوئی غذا کو دوبارہ کھانے پر فطرتاً مجبور ہے، اور اسی طرح سور بھی فطرتاً مجبور ہے کہ دھلنے کے بعد وہ کچھ پیڑیں لوٹے..... بعینہ اسی طرح ہم لوگوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ جب تک انسان کی فطرت نہ بدل دی جائے، وہ باوجود ”اصلاحات“ اور ”انقلابات“ کے ”اصنام“ ہی کا پرستار اور حرص و ہوا ہی کا بندہ بنا رہیگا انسان کی ابتدائی ترقی جس نے موجودہ زمانہ میں ایک ایسی تہذیب اور طرز معاشرت قائم کر رکھی ہے جن کا دار و مدار محض تجارتی مفاد کے اصول پر ہے! لفظ ”ترقی“ کے صحیح مفہوم کی صرف بسم آئے.... لیکن انسان کی ”حقیقی ترقی“ کا دور بھی آکر رہیگا..... اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ابھی سے ہم لوگوں کو

”پیغام فنا“ کی بھی دھمکی دے رہا ہے۔ موجودہ ”ترقی موبوم“ کے تعمیری عناصر مثلاً ”جنگ“ اور ”مقابلہ“ ”حقیقی ترقی“ کے دور میں بجائے سود مند ثابت ہونے کے، انسان کے لئے اسی قدر تخریبی اور مہلک ثابت ہوں گے جس طرح وہ اوصاف جو شیر کو۔ جب تک وہ جنگل میں رہتا ہے۔ ”جنگل کا بادشاہ“ کہے جانے کے قابل بناتے ہیں، اور جب وہ آبادی کی طرف رخ کرتا ہے، تو انھیں اوصاف کی وجہ سے وہ بندوق کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے!

اس طویل بحث کے بعد اب ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی (Social Life) کا انحصار ”بلند مقاصد“ اور ”عقل سلیم“ پر ہے۔ ”جنگ“ اور مقابلہ گرچہ ترقی کے ”دراولین“ میں بہترین افراد کو منتخب کرنے کے لئے نہایت کارآمد ذرائع ثابت ہوئے۔۔۔۔۔ تاہم ”مزید ترقی“ کے دور میں یہ بہت ہی تباہ کن اسباب تنزل بن جائیں گے، دور کیوں جاؤ اُن اقسام کے حیوانات اور نباتات ہی کو دیکھو جو صدیوں کے انتخابات کے نتائج ہیں، دفعتاً جب سلسلہ انتخاب متروک ہو جاتا ہے، تو وہ ”دشمنی“ اور ”خودرو“ ہو جاتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح جب ”جنگ“ ”مقابلہ“ اور ”حرص و ہوا“ کی گرم بازاریاں زور پر ہوں گی، تو ان کا اصلی مطلب (یعنی قوم و ملت کے بہترین افراد کو منتخب کرنا) فوت ہو جائے گا، اور وہ موجودہ نظام مملکت اور طرز تمدن کے ضامن ہونے کے بجائے، تخریبی پہلو اختیار کر لیں گے، اور ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکائیں گے اور موجودہ تہذیب — جو تجارتی مفاد کے اصول پر قائم ہے۔

(Commercial Civilization) اور موجودہ طرز تمدن اس سرعت سے ”مائل بہ تنزل“ ہونگے کہ دیکھنے والا یہ دیکھ کر کہ صدیوں کی ترقیاں چشم زدن میں پیوند خاک ہو گئیں، انگشت بدنداں رہ جائیں گے! ایسے ایسے اتفاقات من گڑھت قصے نہیں ہیں، بلکہ ادراق تاریخ بھی شاہد ہیں کہ قبل اسکے کہ عوام الناس، ترقی کے اُن مدارج پر پہنچ سکیں، جو اعلیٰ ترین اور ارفع ترین انسان کے لئے مخصوص ہیں، ان خطاطوں نے انھیں آدیا ہے۔

اس لئے ہم لوگوں کو یہ خیال خام اپنے سروں سے بالکل نکال ہی دینا چاہئے کہ انسان کی موجودہ نسل کامل ”ترقی“ کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہمیں وہم و گمان ہوتا ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب کبھی ہم کو کسی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اسکا اشداد کر دیتے ہیں۔ اور اسی لئے ہم ترقی..... کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں..... حالانکہ ہم یہ بھول جاتے ہیں

کہ بہت سی برائیاں جن کی ہم گرفت کر سکتے ہیں، وہ زمانہ دراز کے خفیہ مگر مسلسل انحطاط کے نتائج ہیں، جو اب ”امراض کبہ“ کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔... ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کی ناکمل اصلاحیں ”کبہ امراض“ کو اچھا نہیں کر سکتیں۔... اور رونا تو اس کا ہے کہ زندگی کے جن جن شعبوں میں ہم مائل بہ تنزلی ہیں وہاں ہمارے عمدہ اور قابل صد تحسین عادات و اطوار حرکات و سکنات خود ہماری نظروں میں بُرے معلوم ہونے لگتے ہیں اور برخلاف اس کے بُری باتیں بھلی معلوم ہونے لگتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ”ترقی“ کے دھوکے میں اچھی چیزوں کے عوض بُری چیزوں کو اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم لوگوں کی سیاسی تباہی ہمارے بڑے ہی پر جوش مصلحین قوم ہی کے ہاتھوں ہونے کو ہے۔

محمد عثمان۔ ام۔ اے۔ بی۔ ال وکیل ہزاری باغ

(ماخوذ از ہرنار ڈشا)

شہوانیات یا تربیاتی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی برد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ روپے کے مجلد کتاب صرف ۶ روپے میں اور غیر مجلد عاریں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۶ روپے میں اور غیر مجلد ۵ روپے میں علاوہ محصول ۸ روپے کے ملے گی۔

انگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعہ دی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۵، ۳ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے

پیچر نگار لکھنؤ

تراپ شاہ

(۱)

جمیل اور میں ساتھ ساتھ منصفی کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن تقدیر کی ستم ظریفی سے جمیل ایل ایل۔ بی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کے باوجود منصفی کے امتحان میں فیل ہو گیا اور میں قانون سے طبیعتاً متنفر ہونے کے باوجود کانپور کا منصف بنا دیا گیا۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ مجھ نوگز قمار بلانے شروع کے دو تین سال کس طرح کاٹے۔ کالج کی آزاد فضا میں سرکاری ملازمت عبارت تھی تعیش و حکمرانی سے لیکن عالم تخیل سے دنیا کی حقیقت میں آنے کے بعد معلوم ہو گیا کہ یہاں حاکم رکھ کر محکوم اور مسرور رکھ کر منعموم بننا پڑتا ہے۔ کوئی تجویز لکھی اور دل میں چکھے لگ گئے کہ کہیں ملزم اپیل نہ کر دے جو حکامان بالا کے بنے پناہ اعتراضات سے دوچار ہونا پڑے۔ معائنہ کا دن آیا اور جان سن سے ٹکل گئی۔ پیشکار کو ہدایتیں کی جا رہی ہیں کہ دیکھئے صاحب مسلیں بے ترتیب نہ بننے پائیں میز کی چادر پر روشنائی کا دھبہ نہ پڑے۔ خلاصہ یہ ہے کہ علیگڑھ یونیورسٹی کے ماحول سے متاثر ہونے کے باوجود کانپور کے قیام میں آزادانہ زندگی بسر نہ کر سکا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ جن حضرات سے ملنے کو دل چاہتا تھا ان سے ملنا آئین حکمرانی کے خلاف تھا اور جن سے ملنا ضروری تھا وہ ملنے کے قابل نہیں تھے۔ شروع شروع میں شوکت۔ انوار وغیرہ سے پینگ بڑھائے دو دو بجے رات تک برج بھی ہوا پک نیک پارٹی بھی ہوئی جشن کئے لیکن ادھر تو عوام الناس میں یہ مشہور ہو گیا کہ منصف صاحب بالکل صاحبزادے ہیں ”ہو حق“ کے علاوہ کچھ نہیں آتا اور حکامان بالا نے تنبیہ کی غرض مجبور ہو کر یہ رنگ بدلنا پڑا ستین و سنجیدہ بنے تو مابقہ ایسے حضرات سے ہوا جن کا مطلع نظر و جاہت دنیوی حاصل کرنا تھا۔ آج کیا ہے خاں صاحب طلعت زماں تشریف لارہے ہیں۔ وجہ تشریف آوری پوچھئے تو ایک نیاز مند انہ

انداز سے سر جھکا کر ارشاد فرمائیں گے ”جی کچھ نہیں یونہی سلام کرنے حاضر ہو گیا“ حالانکہ اس ”جی کچھ نہیں“ کا مطلب یہ ہے کہ خالص صاحب خان بہادری کے خطاب کی دھن میں ہیں اور اسی لئے ہر حکم کی (خواہ وہ منصف ہی کیوں نہ ہو) دربار داری کی جاتی ہے۔ ان سے فرصت ملی تو لالہ ہری چند داکس آئری منصف نے کرم فرمایا۔ جناب اس لئے تشریف لاتے ہیں کہ ان کی آئری منصفی میں ختم انداز ہونے پائے اور جناب کا تمام تردد وقت یہ ثابت کرنے میں گزرتا ہے کہ خود بدولت ہندو مسلم تعصبات سے بہت بالاتر ہیں بلکہ کچھ فطری رجحان دین اسلام کی طرف ہے حالانکہ ان کے رقیب محمد زماں خاں براہین قاطعہ سے ان کا مسلم کش ہونا ثابت فرماتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں فاروق احمد خاں دیکھنے میں سیدھے سادھے مگر ان کے کاٹے کا مٹر نہیں خدا جانے کتنے حکام کو بدنام کر کے کانپور سے نکلوا چکے ہیں۔ ان کا کام ہے حکام کا آلہ تفریح بن جانا۔ شعرا چھا خاصہ موزوں پڑھ سکتے ہیں مگر جب پڑھیں گے توڑ مڑ کر تاکہ لوگوں کو بیساختہ منسی آجائے انگریزی انٹرنس تک پڑھے ہیں لیکن اورنجیل ناول کو اورنجیل ناول پڑھ کر ایک معصومانہ انداز سے اورنجیل کے معنی بھی پوچھیں گے تاکہ ان کے بھولے ہونے میں کسی کو شک نہ رہے۔ کبھی کسی مقدمے میں سفارش نہیں کریں گے مگر کچھری میں آپ کے بچہ کی دوا لے کر یا کوئی مضحکہ انگیز عذر پیش فرما کر اپنی صورت ضرور دکھا جائیں گے اور اپنے ادبے تبسم سے بے تکلفی کا ثبوت دیکر فریقین سے یا کم از کم مدعا علیہ سے کچھ نہ کچھ وصول فرمالیں گے۔ خود انصاف کیجئے کہ اس قسم کے لوگوں سے میری کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اور اپنی جگہ پر اندازہ فرمائیے کہ اس بے کیفیت زندگی میں ایک مقدمے کے سلسلہ میں جمیل صاحب کا کانپور آنا میرے لئے کس حد تک طرب انگیز ثابت ہوا ہو گا ؟

(۴)

جمیل آئے تو پورا ایک دن بقول نظیری ”سخن گزشتہ“ اور ”گلہ ہائے دراز“ کی نذر ہو گیا۔ اب تک کانپور نہ آنے کی شکایت ہوئی سال میں دو تین دفعہ آنے کے وعدے ہوئے۔ دکالت اور منصفی کے عیوب شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ بیان کئے گئے اور آخر کار باتوں کا ذخیرہ ختم ہو جانے کے بعد انداز ہتفنا کے ساتھ آرام کریسیوں پر دراز ہو گئے۔ دونوں کو احساس تھا کہ آج باتیں بہت کافی کی جا چکی ہیں مگر کبھی کبھی میں بحیثیت میزبان اور جمیل بحیثیت مہمان یہ خیال کر کے کہ یہ خاموشی فریقین پر بار نہ ہو طرح طرح کے لایعنی سوالات کر کے اس طلسم سکوت کو توڑتے رہتے تھے۔ جمیل کے ساتھ تنہا رہنے کی خواہش کے

باوجود دل چاہتا تھا کہ کوئی تیسرا شخص آجائے اور ”جمیل تمھارے یہاں کھانا کون پکاتا ہے؟“ عباس تم نے
 یہ میز کتنے میں خریدی؟“ کے بجائے کوئی دلچسپ گفتگو شروع ہو سکے اور ایسی حالت میں فاروق صاحب کا تابا غنیمت
 معلوم ہوا۔ فاروق صاحب نے معمولی تعارف کے بعد جمیل صاحب کے کانپور تشریف لانے پر یہ مصرع
 پڑھ کر اظہارِ اہتمام فرمایا اور حسبِ معمول اس مصرع کو مصرعِ نہ رہنے دیا۔ ع وہ آئیں گھر میں ہمارے یہ خدا کی قدرت
 اس مصرع نے یادش بخیر حامد حسین کی یاد تازہ کر دی اور میں نے ذرا مسکرا کر جمیل سے کہا ”ہمارے خالص صاحب
 بھی دوسرے حامد ہیں۔ موزوں شعر پڑھنا تو گویا قسم ہے“ فاروق صاحب اپنے ہم مشرب کا ذکر سن کر فرمانے لگے
 ”عباس صاحب یہ حامد کون بزرگوار ہیں؟“ میرے جواب دینے سے قبل جمیل صاحب نے اپنی بتا شروع کر دی
 ”حضرت کیا عرض کروں کہ حامد کتنی خوبیوں کا شخص تھا بس یہ سمجھئے کہ لا جواب تھا۔ نثار بے مثل و بے نظیر تھا آئینہ
 مسلم یونیورسٹی میں بھانت بھانت کے جانوروں پر پھتیاں وہی چست کرتا تھا ہاں شعر و شاعری سے طبیعت کو
 لگاؤ تھا لے دیکے ڈاکٹر اقبال کی کبھی اسے حقیقت منتظر والی غزل یاد تھی لیکن اسے بھی جب پڑھا غیر موزوں
 مگر صاحب کیا آدمی تھا واللہ صمیم معنوں میں دوست کہے جانے کا مستحق۔ فرسٹ ایر سے ہلوگوں کا ساتھ
 ہوا اور آخر تک اس طرح نباہی کہ باید و شاید۔ کیوں عباس تراب شاہ والے معاملے میں اس کا ساتھ دینا یاد
 ہے؟“ تراب شاہ کا نام آنا تھا کہ میں اپنی ساری متانت و سنجیدگی بھول کر بے اختیار ہنسنے لگا۔ میں نے ہنسی کو
 روکنے کی ناکام سعی کر کے کہا ”تراب شاہ نام قوم ہو مسلم“ جمیل صاحب نے اضافہ فرمایا ”ولدیت نام معلوم
 عمر تخمیناً ۴۰ سال“ اور اس تشریح کے بعد ہم لوگوں نے مصنوعی متانت و سنجیدگی سے باری باری حسبِ ذیل حلیہ
 بیان کرنا شروع کیا ”دو ہر ابدن گندمی رنگ“ ”خونیں آنکھیں ڈاڑھی جڑھی ہوئی“ ”ماتھے پر تلوار کا نشان
 واپنے رخسار پر ایک بڑا سامستہ“ ”زیادہ تر گیسوے لباس میں رہتا ہے مگر کبھی کبھی انگریزی کپڑے بھی
 پہن لیتا ہے“ فاروق نے ذرا تنگ ہو کر دریافت کیا ”جمیل صاحب کیا تراب شاہ کوئی خدا رسیدہ فقیر تھے
 جی فقیر و قیر تو کچھ بھی نہیں تھے ہاں ایک نامی گرامی ڈاکو ضرور تھے۔ آپ نے کبھی فرخ آباد کے مشہور ڈاکو
 داراب شاہ کا نام سنا ہے؟ بس یہ تراب شاہ انھیں کا بھتیجہ مشہور تھا لیکن صاحب اس کے کارنامے
 داراب کے کارناموں سے کہیں زیادہ وقیع ہیں“ ”اجی کہیں زیادہ!“ میں نے پروتوق لہجہ میں کہا ”یہ سمجھئے کہ
 علیگڑھ یونیورسٹی کا بچہ بچہ اس سے کا پتا تھا۔ مضبوط سے مضبوط قفل کمروں میں ڈالے جاتے تھے مگر پھر بھی ادن
 یہ فریادیں سننے میں آتی تھیں کہ تراب شاہ کمرے کا قفل توڑ کر روپیہ پیسہ سوٹ بوٹ کھانے پینے کا سامان

نکال لئے گیا اور لطف یہ ہے کہ۔ ”تراب شاہ کا وجود ہی نہ تھا، جمیل نے بات کاٹ کر کہا۔ ”گم“ فاروق صاحب بولے ”جب اس کا وجود ہی نہیں تھا تو اس نے یہ چوریاں کیوں نکریں اور اس کا حلیہ آپ حضرات کو کیوں حفظ ہے؟ مگر صاحب اس کا وجود تھا ضرور اگرچہ وہ وجود تخیلی ہی کیوں نہ ہو اور حق تو یہ ہے کہ وجود تخیلی از دیاد شہرت کا سبب ہوتا ہے۔ سری کرشن کو دیکھئے نا۔ اگر ان کو محض ریغام اعظم تسلیم کر لیا جاتا تو وہ عوام الناس کے دلوں کو اتنا مسخر نہیں کر سکتے تھے جتنا ان کی خیالی تصویر نے کرشن بھگوان بن کر کیا۔ حضرت غوث الاعظم کی شخصیت بحیثیت مصنف غنیۃ الطالبین یا بحیثیت ایک صوفی صافی کے اتنی جاذب نہیں ہے جتنی قطب ربانی محبوب سبحانی محی اموات خواجہ کائنات کے اضافہ سے ہو جاتی ہے۔ پھر کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیالی کرشن بھگوان، یا فرضی ”محبوب سبحانی“ نے کارہائے نایاں انجام نہیں دئے؟ کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ ان ”جلیل القدر مستہیوں“ نے لاکھوں عقیدتمندوں کی بیماری کو مبدل بہ صحت ناامیدی کو مبدل بہ اُمید کر دیا؟ جب یہ باتیں قابل تسلیم ہیں تو پھر تراب شاہ کی تخیلی ہستی سے انکار کیوں کیجئے اور اس کے کارناموں پر ایمان لانے سے کیوں ابا کیجئے؟ فاروق صاحب نے انداز معصومانہ سے سوال کیا، عباس صاحب آپ کی فلسفیانہ تقریر تو ہمارے سمجھ میں آئی نہیں اب یہ فرمائیے کہ کیا واقعی تراب شاہ ایک فرضی نام تھا اور آخر یہ نام رکھا کس نے؟ ”وہ مجھے سنئے، جمیل نے مسکرا کر کہا ”عباس اور میں ایک دن بغیر اجازت لئے ہوئے قریب شام مچھلی کا شکار کھینے گئے۔ ہوا تیز تھی کوئی مچھلی لگی نہیں ہم نے سوچا لاؤ نہا ہی ڈالیں۔ بنسیاں اور کپڑے کنارے پر رکھ دئے اور جھم سے نہر میں کود پڑے۔ پیراک ہم دونوں اچھے تھے میری مچھلی کے شاگردان خاص میں شمار ہوتا تھا دور تک پیرتے ہوئے چلے گئے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی صاحب کپڑے اور بنسیاں غائب کر لے گئے ہیں۔ پہلے تو یہ سمجھ کر کہ کسی بے تکلف دوست نے کرم فرمایا ہے دو چار آوازیں مرتضیٰ خاں وغیرہ کو دیں پھر لاکھوں قسمیں خدا اور رسول کی دیں اظہار ناراضگی کیا اس قسم کے تکلیف دہ مذاق کرنے والے پر تبر ابازی ہوئی شدید انتقام کی دھمکیاں دی گئیں مگر جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو چار و ناچار کنارے پر آکر بیٹھ گئے۔ عباس اس زمانے میں شرلاک ہومز کے افسانے بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے انھوں نے یہ ترکیب بتائی کہ رات کے دس بجے تک یہیں بیٹھے ہو اس کے بعد یونیورسٹی چل دو کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ عنیک کا فریم بدلوانے شہر گئے تھے وہاں سے قلعہ کی طرف ہوتے ہوئے واپس آرہے تھے راستے میں ایک لمبے ترنگے بد معاش نے کپڑے و پٹے سب اتر وائے خیر صاحب کوئی گیارہ بجے کے قریب باب الرحمتہ پہنچے۔ سپاہی نے پہلے تو یہ ہیئت کذا فی دیکھ کر اندر

آنے سے روکا لیکن جب نام دریافت کیا اور ہماری فرضی داستان سنی تو ہمیں لئے ہوئے پرووائس چائلر صاحب کی کوٹھی میں چلا گیا۔ ہم نے یہاں بھی اپنی پتاد ہرا دی۔ پہلے تو پرووائس چائلر صاحب کو کچھ یقین نہیں آیا فرمانے لگے آپ کو پولیس میں بیان دینا ہوگا لیکن اگر آپ سارا حال مجھے بیان کر دیں تو میں اس معاملہ کو ختم کر دوں گا لیکن جب ہم دونوں نے بیان دینا بھی منظور کر لیا تو وہ کچھ نرم پڑ گئے دو بڑے تو لئے منگوا کے دئے اور کہنے لگے اس وقت تو آپ اپنے کمرے میں جائیں صبح ۸ بجے تشریف لائیے کو تو ال شہر آپ کے بیان یگا۔ میں سوچا کہ بڑے پھنسے اور میں نے عباس سے کہا بھی کہ میاں صبح ۸ بجے سے پیشتر پرووائس چائلر صاحب سے سارا حال بیان کر دو بہت کریں گے کچھ جرم نہ کر دیں گے خیر اس پولیس کی پکڑ دھکڑ سے تو بہتر ہے مگر صاحب یہ تو۔۔۔ جمیل کو اتنی دیر تک مصروف دیکھ کر مجھے غبطہ ہونے لگا تھا میں نے بات کاٹ کر کہا ”جی ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے شہر لاک ہو مرنانی کا لقب عطا فرمائیں گے مگر خدا کے لئے فاروق صاحب آپ ہی بتائیں کہ اگر میں جمیل کے کہنے پر عمل کر لیتا تو کیا حشر ہوتا بغیر پاس کے شہر جانا پہلا جرم، ابجے تک واپس نہ آنا دوسرا جرم پرووائس چائلر سے غلط بیانی کا ارتکاب تیسرا جرم کہنے یونیورسٹی سے نکالے جانے میں کیا کسر باقی رہ جاتی؟ پولیس کو بیان دینے میں کوئی خطرہ ہی نہ تھا بڑے شہروں میں ایک آدمی بد معاش رہتے ہی ہیں کو تو ال شہر کو ہم پر غلط بیانی کا شبہ کیوں ہونے لگا تھا اور اس کے علاوہ۔۔۔“ ”لہذا بات نہ کاٹا کرو“ جمیل نے ذرا جھنجھلا کر کہا ”مجھے قصہ تو ختم کر لینے دیا ہوتا ہاں صاحب خلاصہ یہ ہے کہ میں نے عباس کی رائے پر چلنا بہتر سمجھا اور صبح ہی صبح اپنے روم فیلو حامد کو بھی اس راز میں شریک کر لیا۔ حامد کو تو ال شہر کے دور کے رشتہ دار تھے اور ان سے کافی مدد ملنے کی توقع تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے پرووائس چائلر صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوئے کو تو ال صاحب ہلوگوں کو حامد کی وجہ سے جانتے تھے نہایت نرمی سے تمام داستان بیان کرنے کو کہا۔ ہم نے لہجہ میں سوز و گداز پیدا کر کے اپنی پتاد سنائی فرمانے لگے اس کا حلیہ آپ کو یاد ہے۔ یہاں پر میں رکا مگر عباس نے خدا جانے کس کتاب میں کس شخص کا حلیہ دیکھا تھا کہ تیزی کے ساتھ وہی حلیہ بیان کرنا شروع کر دیا جو ہلوگ کچھ دیر پیشتر آپ کو سنا چکے ہیں۔ جب واپس رہنے رخسار پر بڑے سے مسہ کا ذکر کیا تو کو تو ال صاحب کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی ارشاد ہوا کہ آپ بالکل درست فرماتے ہیں موضع نیول پور میں جو ڈکیتی ہوئی تھی اس کے سلسلہ میں جو کیدار نے بیان کیا تھا کہ ایک ڈاکو کے گال پر بڑا سا نشان تھا غالباً

بوکھلاہٹ میں وہ مسہ کو نشان سمجھا بلکہ چوکیدار تو اس کا کچھ نام بھی بتاتا تھا۔ تراب شاہ تو نام نہیں بھتا عباس نے ذرا مسکرا کر کہا۔ کو تو ال صاحب نے مشکوک نظروں سے عباس کو دیکھا فرمانے لگے نام آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ عباس نے بلا کسی جھپک کے کہنا شروع کیا جی کیا عرض کروں جب ہلوگ چلنے لگے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ اگر پولیس میں رپورٹ کرنا تو تھا سیندار سے کہہ دینا کہ اگر تمہیں ناکوں چنے نہ چبوائے تو راجپوت کا لڑکا نہیں اور تراب شاہ نام نہیں اب تو کو تو ال صاحب کی برہمی کی کوئی انتہا نہیں رہی کہنے لگے صاحبزادے تمہارے تراب شاہ ایسے سینکڑوں آدمی کا لے پانی بھجوا چکا ہوں وہ ہے کیا چیز کو تو ال صاحب تو برہم ہو رہے تھے اور ہمارے پرو وائس چانسلر صاحب خندہ زیر لب فرما رہے تھے۔

میں ڈرایہ کہہیں عباس کے آخری فقرے سے وہ کھٹک نہ گئے ہوں اور اس لئے چپ چاپ جازت لیکر واپس چلا آنا بہتر سمجھا۔ دوسرے دن حامد سے معلوم ہوا کہ پرو وائس چانسلر صاحب اپنے ایک چراسی کو ساتھ لیکر کو تو ال صاحب کے پاس گئے ان کا خیال تھا کہ چراسی نے ان کی بیگم صاحبہ کا نیکلس چرایا ہے مگر چراسی لاکھوں قسین کھاتا تھا اور کہتا تھا کہ کل شب کو میں نے ایک آدمی کو جس کے گال پر بڑا سامسہ تھا آپ کی کوٹھی کے پاس دیکھا تھا کو تو ال صاحب اس بیان پر بہت ہنسے کہنے لگے فرمائیے جناب اب یہ لڑکوں کا مذاق تھا یا اصلیت؟ میری عمر پولیس کی ملازمت میں بسر ہوئی ہے میں ایک نظر میں پہچان لیتا ہوں کہ کون آدمی سچا ہے اور کون جھوٹا۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق میں عباس اور جمیل کے بیان کو مذاق پر محمول کروں تو یہ نیکلس کا واقعہ ان کے بیان کی تائید کرتا ہے آپ ہی فرمائیں کہ آخر چراسی کو تراب شاہ کا حلیہ کیسے معلوم ہوا؟ اسے بھی جانے دیجئے نیول پور کے چوکیدار کو کیا غرض تھی کہ وہ فرضی حلیہ بیان کرتا؟ اس کے علاوہ میں نے اپنے طور پر حامد سے بھی دریافت کیا یہ قسین کھاتے ہیں کہ عباس اور جمیل کے بیان میں مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا۔ آپ کی خوشی ہے تو میں چراسی پر تشدد کرنے کے لئے طیار ہوں مگر یہ یاد رکھئے کہ نیکلس کا ملنا منحصر ہے تراب شاہ کی گرفتاری پر اور وہی ہوا کہ کو تو ال صاحب کے تشدد کے باوجود چراسی نے اعتراف جرم نہیں کیا۔ نیکلس کا قصہ مشہور ہونا تھا کہ تراب شاہ کالج کی چار دیواری کے علاوہ شہر میں بھی بہت کافی مشہور ہو گئے۔ کہیں نقب زنی ہوئی تراب شاہ کا ذکر خیر موجود کوئی قتل ہوا قاتل تراب شاہ فرض کئے گئے۔ یونیورسٹی کے کسی طالب علم کی کوئی چیز گم ہوئی تراب شاہ ملزم ٹھہرائے گئے۔ اسی زمانہ میں ایک مقامی اخبار نے تراب شاہ کے کچھ غیر العقول

واقعات بھی سپرد قلم فرمائے تھے مثلاً تراب شاہ روپیہ کو دو انگلیوں سے توڑ سکتا ہے اس کا روسیوں سے ساز باز ہے نہایت معتبر ذریعہ سے اطلاع ملی ہے کہ اس کے پاس کئی سو بند و قیس بھی ہیں غرض سال ڈیڑھ سال تک ایک ہنگامہ عظیم برپا رہا۔ متعدد کانسلٹلوں نے بارہا اسے شہر کی گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا لیکن گرفتار آخر وقت تک نہ کر سکے اور جب دو تین ماہ تک کوئی نیا جرم نہیں ہوا تو ارباب حل و عقد نے بجائے خود یہ طے کر لیا کہ تراب شاہ کا انتقال ہو گیا۔ جتنے واقعات تھے وہ بے کم و کاست عرض کر دئے اب تراب شاہ کی حقیقی یا فرضی ہستی کا بہتر فیصلہ آپ خود فرما سکتے ہیں "فارق صاحب کچھ فرمانے والے تھے کہ میں بول اٹھا "مگر جمیل تم نے ایک خاص واقعہ بیان نہیں کیا۔ فاروق صاحب ایک دن ہمارے کمرے کا بوائے امین کسی ضرورت سے شہر گیا واپس آیا تو سراپا سمہ و بدحواس میں نے پوچھا خیر تو ہے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو، کہنے لگا میاں ڈگی تال کے پاس ایک آدمی ملا تھا جسکے گال پر بڑا سامستہ تھا مجھ سے پوچھنے لگا تم عباس صاحب یا جمیل صاحب کو جانتے ہو میں نے کہا کیوں تمہیں کیا کام ہے کہنے لگا کام کیا جب ملنا تو کہہ دینا کہ تراب شاہ نے سلام کہا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید کسی چیز کو چرانے کے لئے بوائے نے یہ قصہ گڑھ لیا ہو مگر ہمارے کمرے سے ایک تنکا بھی چوری نہ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بوائے کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے اور کیا واقعی کوئی شخص ایسا موجود تھا جس کا حلیہ ہمارے بیان کردہ حلیہ سے ملتا تھا؟ فاروق صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "عباس صاحب کیا خوب کہا ہے غالب مرحوم نے کہ عالم تمام ایک حلقہ دام خیال ہے" اور جمیل اس مصرع پر بے اختیار ہنسنے لگے۔

طالب صفوی

ضرورت ہوشوہری کی

ایک ۸ سال کی نوجوان، خوش رو، سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے — معاش کی طرف سے اطمینان ہونا چاہئے، اور عمر ۱۵ سال سے زائد نہ ہو۔ یوپی کے باشندہ کو ترجیح دی جائے گی۔ — اڈیٹر صاحب نگار سے ہر طرح کا اطمینان کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ لڑکی اور اس کے خاندان سے بخوبی واقف ہیں — خط و کتابت اس پتہ سے کی جائے:۔

ا۔ ن۔ ذریعہ منیجر نگار۔ لکھنؤ

مکتوبات نیاز

گزشتہ ماہ کی اشاعت میں آئندہ سے اس سلسلہ کے بند کرنے کا اعلان کیا گیا تھا، لیکن ناظرین کے اصرار پر اسے دسمبر تک اور قائم رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ غالباً اس وقت تک مکتوبات کتابی صورت میں ناظرین تک پہنچ جائے گی۔

نیاز

وہ جام دینا کی سرگوشیاں، وہ چین چین میں درختوں کی گل پوشیاں، وہ ہلکی ہلکی پھوار، وہ رندان بدست کا ہنگامہ "بادہ بیار"! — آہ کیا پوچھتے ہو

رات کس درجہ یاد آئے ہو تم

بجلی چمکتی تھی اور تمہارا تبسم نگاہوں میں پھر جاتا تھا، سر و شمشاد ہوا سے جھومتے تھے اور تمہاری رعنائیاں آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھیں، ساغر میں شراب چھلکتی ہوئی دیکھتا تھا اور تمہاری آنکھوں کا تصور ستانے لگتا تھا — اور —

گل دیدے دروئے ترا یاد کر دے

پھر بتاؤ، تمہیں بتاؤ کہ

نریب خوردہ یرنگ وعدہ ہائے تو کیست ؟

وہ — جن کے پاس بے بلائے پہنچ جاتے ہو۔ یا میں — جس کے حق میں ایفاء عہد کی تم نے قسم کھالی ہے۔

اے، لاحول ولاقوۃ، کہاں کا جام و سہر، کیسی بادہ خواری !

آشفگی کجا و ہوا سے چین کجا

تم نہ آئے تو ساری رات اسی اہتمام کے تصور میں کٹ گئی، جی چاہا کہ تمہیں بھی ستاؤں، یعنی تم پر

ظاہر کردوں کہ

تم نہ آئے تو کیا حسرت نہ ہوئی

ہوئی اور خوب ٹھاٹھ سے ہوئی، لیکن اس تنک ظرفی کا بُرا ہو کہ جھوٹ بولنے کی بھی سمائی نہیں۔
 یہ بیکسی کی آخری حد ہے۔ اب بھی اگر تم کو رحم نہ آئے تو خدا تم پر رحم کرے۔

نیاز

الفت پناہ، مودت دستگاہ،

گرامی نامہ پہنچا، سینہ پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، اور دیر تک سوچتا رہا کہ آپ کے الطاف بے پایاں
 کا اعتراف کیونکر ممکن ہے۔ اگر روح القدس اپنی زبان مجھے دے بھی دیں، تو خضر الیاس اپنی عمریں کیوں
 دینے لگے اور اگر یہ دردوں باتیں ممکن ہوں تو بھی اس کا کیا علاج کہ بہ اندازہ تاثر میرے نزدیک وہ بھی
 ناقص ہے اور یہ بھی مختصر! آپ فرمائیں گے کہ یہ سب تکلف و تصنع ہے، میں عرض کروں گا

زخود بچوئے کہ مارا چہ درد دل افتاد دست

آپ کہیں گے کہ یہ شاعری ہے میں کہوں گا ”آداب عرض ہے“

بہر حال آپ کو نہیں معلوم، میں جانتا ہوں کہ آپ کا یہ التفات کیا مجھے کافر بنائے بغیر چھوڑتا ہے؟
 زندہ و سلامت رہئے اور اسی انداز سے

عمر محبت دراز، رشتہ الفت رسا!

نیاز

لاحول ولاقوہ، مصائب سے گھبراتے ہو، آلام و افکار سے پریشان ہوتے ہو، اور یہ نہیں
 دیکھتے کہ تم اتنے ”اچھے“ کیوں ہو۔

تونالی از خلہ خار و شگری کہ سپہر
 سر حسین علی برسناں بگرداند

زمانہ کا دستہ ہمیشہ سے یہی چلا آیا ہے، اچھوں کی زندگی سدا یونہی بُری بسر ہوتی ہے، پہلو میں دل رکھتے ہو
 تو دکھاتا پڑے ہی گا، شکوہ و شکایت بیکار ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ تم جن کے لئے تباہ ہو، وہی تم سے بیزار ہیں، جن کی دوستی میں تم برباد ہوئے

وہی تمہارے دشمن ہیں، لیکن کیا یہ تجربہ تمہاری یاد دنیا کی فطرت کو بدل دے گا۔ وہ نہیں تو اور ہزار ہیں تمہاری نیکی سلامت چاہئے، دشمنوں کی کیا کمی۔ سونا ہونے کا دعویٰ ہے تو بار بار تپا یا جانا ضرور۔

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ

آنچه کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زند

میں ذاکر صاحب سے ابھی تک نہیں مل سکا اور ملوں بھی تو کس اُمید پر، جانتا ہوں کہ زبان سے ”نہیں“ کبھی نکلے گا نہیں اور دل کبھی ”ہاں“ کرنے کا نہیں۔

نیاز

مسکین خبر از لذت آزار نہ دارد

خارم کن و در رگہ ز چارہ گرم ریز

غالب کا یہ شعر مجھے بہت زمانہ سے یاد ہے، مگر جو بحث آپ نے پیش کی ہے وہ کبھی میرے خیال میں بھی نہ آئی تھی۔

آپ پوچھتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں لفظ ”کن“ بالفتح پڑھا جائے یا بالضم، یعنی اسے ”کندن“ کا امر سمجھا جائے یا کردن کا۔ میرے نزدیک ہر وہ شخص جس کو فارسی زبان اور غالب کے ذوق شعری کا صحیح علم ہے، اس کے ذہن میں بھی کبھی یہ اختلافی صورت نہیں آ سکتی، معلوم نہیں آپ کے احباب کو کیوں غلطی پیدا ہو گئی۔

شاعر کا مقصود یہ کہنا ہے کہ۔۔۔ ”چارہ گر جو مجھے صبر و ضبط یا ترک محبت کی ہدایت کرتا ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ غریب لذت آزار سے آگاہ نہیں، اس لئے اسے خدا تو اسے بھی اس آزار سے آشنا کر دے تاکہ وہ اپنی پسند و نصیحت سے باز آ جائے“

اس مفہوم سے غالباً آپ کو بھی انکار نہ ہوگا، پھر خود فیصلہ کیجئے کہ اس صورت میں یہ کہنا زیادہ سوزوں ہوگا کہ ”مجھے کانٹا بنا کر چارہ گر کی راہ میں ڈال دے“ یا یہ کہ ”میرا کانٹا نکال کر اسکی رگہ ز میں ڈال دے“ ظاہر ہے کہ نہ رگہ ز سے مراد واقعی رگہ ز ہے اور نہ خار سے مراد واقعی خار بلکہ ایسا اشارہ ہے چارہ گر کی زندگی اور آزار محبت کی طرف، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ”مجھے کانٹا بنا کر اس کی راہ میں ڈال دے“ تو ظاہر ہے کہ خیال خار و رگہ ز کے لغوی معنی کی طرف منتقل ہوگا جو مقصود نہیں، لیکن بصورت دیگر

مفہوم میں وہی معنوی رنگ پیدا ہو جائے گا جو شاعر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

علاوہ اس کے ”مجھے کانٹا بنا کر راہ میں ڈال دے“ کہنا اس وقت زیادہ موزوں ہوتا، جب جذبہ انتقام بھی اس میں شامل ہوتا لیکن پہلے مصرعہ میں لفظ ”مسکین“ اس خیال کے منافی ہے۔ اسی کے ساتھ ”فارسیہ“ کا اقتضا بھی یہی ہے کہ اسے کندن کا صیغہ امر قرار دیا جائے۔

نیاز

آپ بھی سن لیجئے اور اُن سے بھی کہہ دیجئے کہ اعتراضِ محبت کوئی گناہ نہیں کہ اس کی تعزیر میں آزمائش و امتحان کے مبادیات طے کرنا ضروری ہوں۔ غالب کہتا ہے

نخلتِ نگر کہ در حنا تم نیا فتنہ
جز روزہ درست ز صہبا کشودہ

مگر یہاں تو انشاء اللہ نامہ اعمال بالکل کوراہی ملے گا، وہاں کم از کم ایک روزہ تو تھا خواہ وہ شراب ہی سے کیوں نہ کھولا گیا ہو، مگر یہاں تو ساری عمر اس حسرت میں بسر ہوئی کہ شراب ہوتی تو روزہ رکھا جاتا۔

بہر حال اُن سے محبت کرتا ہوں اور بالکل بے وجہ، اس لئے نہ مجھے دلیل لانے کی ضرورت اور نہیں امتحان لینے کی۔ وہ مجھے بلاتے ہیں شکریہ، لیکن اگر میرا آنا ”شرطِ وفا“ قرار دیا جاتا ہے تو کہہ دیجئے میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

وہ خود تو مارے معشوقیت کے میری ایک بات نہ مانیں اور میں پس پس کے برابر گردِ رہ بنتا چلا جاؤں خوب!۔ اُن سے کہہ دیجئے کہ اگر وصلِ لیلیٰ کی شرط یہی ٹھہری ہے

تو استغفارِ ابا حسرت دیا

آج سے نہ وہ میرے محبوب، نہ میں ان کا چاہنے والا۔

لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

نیاز

کرم فرمائے بندہ۔

کل جعفر صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ میری طرف سے لبریز شکایت ہیں، خیر، یہاں تک تو

کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن سنا گیا ہے کہ آپ نے مجمع احباب میں بعض ایسے الفاظ سے بھی یاد کیا جو نقطوں سے یکسر بیگانہ تھے۔ حیرت ہے کہ آپ نے کیوں اس قدر التفات فرادوں سے کام لیا۔
 آپ میرے بزرگ ہیں میرے بزرگوں کے ملنے والے ہیں، پیرزادے ہیں، حسنی حسینی سید ہیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ اس وقت تک تو میں اپنے آپ کو ایسا مکار و فریبی نہیں سمجھتا تھا، لیکن اب چونکہ آپ ایسا فرماتے ہیں، اس لئے ویسا بن جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔

گفتہ بودی ہمہ زر قند و فریبند فسوس
 سعدی آن نیست و لیکن چو تو فرمائی ہست

چونکہ جناب کی اس توجہ کا شکریہ لازم تھا اس لئے یہ چند سطریں سپرد قلم کی گئیں، ورنہ اس سے منشاء حاشا، و کلا یہ ظاہر کرنا نہیں کہ میں کچھ اصلاح کی طرف مائل ہو گیا ہوں یا یہ کہ آپ کی بدعاؤں نے مجھے آل کے طرف سے خالی بنا دیا ہے۔ یہاں تو جو سیراہ روی اول دن اختیار کر لی تھی، بھگوان اللہ وہی اب تک قائم ہے۔

آپ کے مذہب و ایقان کی بلندی سے ناواقف نہیں لیکن اپنے متعلق کس زبان سے عرض کروں کہ

کردہ ام ایمان خود را دستمزد و خوشستن
 می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم
 لکم و سینکم ولی دین

خاطی و گناہگار
 نیاز

تو یہ کہئے آپ مجھ سے خفا ہیں! اور صرف اس لئے کہ میں نے آپ کے اُسی ایک خط کا جواب کیوں نہ دیا جو جواب طلب نہ تھا۔

بندہ خدا، یہ تو سوچ کہ تم ۷۲ کو لکھ رہے ہو کہ ”میں ۲۸ کو جا رہا ہوں“ پھر میں تمہیں ”خدا حافظ“ کہتا بھی تو کس پتہ سے؟ میں انتظار میں تھا کہ منزل مقصود تک پہنچ جانے کے بعد تم پھر مجھے اطلاع دو گے اور میں دعائیں یا گالیاں جو کچھ دینا ہیں اسی وقت تفصیل سے دے لوں گا۔ مگر یہ خبر نہ تھی کہ خدا کی بارگاہ

تک پہنچ کر انسان میں خود بھی ”پندار خدائی“ پیدا ہو جاتا ہے، جس کا بڑا کارنامہ صرف ”بیچا“ بن جانا ہے۔ بہر حال شکر ہے کہ آپ مع الخیر اس مذہبی سفر سے واپس آ گئے، آپ اگر خدائیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کیجئے کہ تبرکات میں سے مجھے کچھ نہ دیجئے، لیکن کسی بندہ کو دائرہ بندگی سے خارج کر دینا، کہاں کی شانِ خداوندی ہے! — مدعا یہ کہ مجھ سے بولے خواہ وہ کتنی ہی برہمی کے ساتھ ہو اور مجھ کو خط لکھنے خواہ آئیں گالیاں ہی گالیاں کیوں نہ ہو۔

آپ سے ملنے کے بعد ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ اہرن بھی ایسی بُری چیز نہیں، پھر یہ خفگی بیکار ہے۔
نیاز

مکرمی۔

آپ نے جس مضمون کی طرف مجھے متوجہ کیا ہے، وہ میری نگاہ سے گزر چکا ہے۔ لیکن آپ میرے مسلک سے پوری طرح آگاہ ہیں اور اس لئے مجھ سے یہ توقع رکھنا کہ اس کا جواب دوں بیکار ہے۔
مہ نور می فشان دوسگ بانگ می زند

اور فرمائے آپ کے مشاغل کا کیا رنگ ہے؟ وہی ساری دنیا کا غم لئے ہوئے پھرنا اور ایک لفظ شکایت کا منہ سے نہ نکالنا۔!

اے خوشا عمرے کہ صرف راہ استغنا شود

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ سے زیادہ اس رمز کا سمجھنے والا مجھے تو کوئی دوسرا نظر آیا نہیں۔ اگر قربانیاں کرتے کرتے کوئی ہستی کبھی خود دیوتا بن سکتی ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ سے بڑا دیوتا پیدا ہونا اس صدی میں ممکن ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کا انکسار اسے بھی تسلیم نہ کرے گا۔

نیاز

فلسفہ مذہب

مذہب اسلام اور اس کے مراسم و شعائر پر تفصیلی بحث و تنقید اگر آپ اسلام کی تقلید سمجھ کر کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں۔ قیمت علاوہ محصول ۵۰۰۔ نیچر نگار۔ لکھنؤ

باب المراسلة والمناظرة

(اصغر گونڈوی کی شاعری)

ادیب محرم دامت افاد الکم — مجھے اس بات کا اعتقاد ہے کہ آپ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنی رائے کے خلاف کوئی صدا بلند ہوتے ہوئے سن نہیں سکتے۔ آپ کا طرز عمل شاہد ہے کہ اگر کسی نے آپ کو گالیاں بھی دی ہیں تو آپ نے اس کو بھی شائع کر کے معقول جواب دیا ہے لہذا میں اس کی امید نہیں رکھتا کہ آپ اس مضمون کو محض اس لئے واپس کر دیں گے کہ یہ آپ کے ریویو کا جواب ہے۔ آپ اسکی مخالفت میں جو چاہے وہ نوٹ لکھ دیں لیکن براہ عنایت اپنے رسالہ میں جگہ دیکر اپنی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیجئے۔ اور مجھے رہن منت بنائے مضمون کسی قدر طولانی ضرور ہے لیکن اس سے بہت زیادہ طولانی مضامین آپ کے رسالہ میں نکل چکے ہیں

نیاز کیش

شمس الدین

مندرجہ بالا کتاب پر نگار ماہ جون ۱۹۳۲ء میں اڈیٹر کار یو یو میری نظر سے گزرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کم جستی کی وجہ سے اڈیٹر صاحب نے پوری کتاب نہیں دیکھی۔ یہ رائے ان کی بیشک صحیح ہے کہ پہلی ہی نظر میں ذاتیات کا گمان کر کے اس کتاب کی نسبت خراب رائے قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص شروع سے آخر تک کتاب دیکھ جائے گا تو مجبوراً اس کو اپنی رائے بدلنا پڑے گی اس سبب سے کہ کتاب

بھر میں اصغر صاحب کہیں بھی مخاطب نہیں ہیں اور نہ ان کو براہ راست چیلنج دئے گئے ہیں بلکہ چیلنج ان کے مداحین کو دئے گئے ہیں جنہوں نے ایک ہنگامہ اٹھا کر اصغر صاحب کے مقابلہ میں تمام شعر کو ذلیل کر کے انصاف پسند لوگوں کے دلوں کو تکلیف پہنچائی ہے۔

میں اُسی کتاب کے صفحہ ۸۴ و ۸۵ سے ایک فقرہ سرکوب صاحب کا لکھتا ہوں ”دنیا جو چاہے سمجھ لے لیکن حقیقت میں میں اصغر صاحب کے خلاف نہیں ہوں بلکہ اُن لوگوں کے خلاف ہوں جو اصغر صاحب کی شاعری سے بخوبی واقف ہیں پھر بھی ان کو خلاف واقعہ بڑھاتے ہیں“ اور صرف اسی ایک فقرے پر موقوف نہیں ہو بلکہ تمام کتاب اس قسم کے مضامین سے بھری ہوئی ہے کہ اصغر صاحب کی مخالفت محض اُن کے مداحوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو اصغر کے مقابلے میں مشاق اور قادر الکلام شعرا کی توہین و تذلیل کرتے ہیں۔ اصغر کے دوستوں کو تو اصغر کی توہین ناگوار ہوتی ہے لیکن کسی دوسرے کو بالکمال شعرا کی توہین و تذلیل اصغر ایسے شخص کے مقابلہ میں جو ایک نشست میں دو ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتے ناگوار نہیں ہو سکتی۔ کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ کر ایک شخص بھی یہ رائے قائم نہیں کر سکتا کہ سرکوب کو یا اس کتاب کے کسی مضمون نگار کو اصغر سے کچھ ذاتی مخالفت ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ معرض بحث میں اصغر صاحب ہی ہیں اس سبب سے نتیجہ جو نکلتا ہے وہ اصغر ہی کے خلاف نکلتا ہے اسی دھوکے میں آکر اڈیٹر صاحب نے بغیر کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھے ذاتی مخالفت کا گمان کر لیا۔

ہم اڈیٹر صاحب کے نہایت ممتوں ہوں گے اگر وہ اصغر صاحب یا اُن کے دوستوں سے دریافت کر کے کوئی واقعہ ایسا لکھ دیں جس سے اس کا شبہ بھی ہو سکے کہ سرکوب صاحب کو اصغر صاحب سے کوئی ذاتی رنج یا خصومت ہے۔ مبصر کی کسی اشاعت میں ایک مضمون سرکوب صاحب کا شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ میرا اور اصغر کا ساتھ تین برس تک انڈین پریس میں رہا ہے اس درمیان میں میرے اور ان کے تعلقات ایسے خوشگوار رہے ہیں کہ کسی قسم کی شکر رنجی تو درکنار کبھی کسی معاملہ میں رائے یک میں بھی اختلاف نہیں ہوا لیکن مجھ کو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ اصغر صاحب نہایت کم مشق شاعر ہیں اور فن شعر سے بالکل ناواقف۔

اصغر صاحب بھی اس کو مانتے ہیں کہ مجھ سے اور سرکوب صاحب سے کوئی ذاتی خصومت نہیں ہے اڈیٹر صاحب خود ان سے دریافت کر سکتے ہیں۔

بھلا سر کو ب ایسے بے نیاز شخص کو کسی سے ذاتی خصومت شاعری کے معاملہ میں کیا ہو سکتی ہے جس کو نہ شہرت کی پروانہ تعریف کی، ان کا کلام قریب قریب ہر ادبی رسالہ میں شائع ہوا کرتا ہے لیکن ان کے نام سے نہیں بلکہ دوسروں کے نام سے، یہ الزام ان پر بہت صحیح ہے کہ وہ اپنے نام سے کچھ نہیں کہتے بلکہ دوسروں کو اشعار کہہ کر بلا معاوضہ دیدیا کرتے ہیں جس سے اصغر صاحب بھی بخوبی واقف ہیں اگر کسی کی فرمائش سے کچھ اپنے نام سے کبھی پڑھتے بھی ہیں تو اس کو محفوظ نہیں کرتے اس وقت ایک مصرع بھی ان کے پاس محفوظ نہیں ہے لوگ ان پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ ان جواب پاروں کو کیوں ضائع کر دیتے ہیں تو اس کا جواب یہی ملتا ہے کہ یہ میرے جذبات نہیں تھے بلکہ دوسروں کی فرمائش سے مجبور ہو کر میں نے کہا تھا اس کے حکم کی تعمیل ہو گئی پھر اب ان کے رکھنے کی کیا ضرورت ہے غرض یہ کہ ان کا مزاج ہی ایسا نہیں ہے کہ ان سے شاعری میں کسی سے ذاتی خصومت ہو سکے۔ یہ جھگڑا ذاتی خصومت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اسوجہ سے ہے کہ وہ اصغر کی قابلیت سے اچھی طرح واقف ہیں اور مداحان اصغر جو اصغر کو با کمال شعرا پر ترجیح دیتے ہیں ان کو ناگوار ہوتا ہے۔

اس سے اڈیٹر صاحب بھی واقف ہیں کہ اصغر کے مداحوں نے کیا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ نگار ہی کے کسی اشاعت میں مرزا احسان احمد کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں اصغر کے مقابلے میں شعرائے لکھنؤ کے ذلیل کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا گیا یہاں تک الفاظ ہیں کہ "اصغر لکھنؤ کے گزشتہ و موجودہ شاعروں سے بہتر ہیں" مرقع میں ذاتی صاحب نے جو زہرا گلا ہے اس سے بھی غالباً اڈیٹر صاحب ناواقف نہ ہوں گے اس میں بھی یہاں تک لکھا گیا ہے کہ جس حد کمال پر شعرائے سابقہ و حال کی شاعری ختم ہو جاتی ہے وہاں سے اصغر کی شاعری شروع ہوتی ہے کیا کسی کی تعریف کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کے مقابلے میں استاد ان گزشتہ و موجودہ ذلیل کئے جائیں۔ اسی اصغر کی شاعری حصہ اول میں اڈیٹر صاحب بخود فیض آبادی کا مضمون ملاحظہ کر لیں کہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ اصغر امام المتغزلین پیغمبر ذوق سلیم ہیں انھوں نے بڑے بڑے عفاریت سخن کو میدان شاعری میں پچھاڑ دیا ہے اور مخالفین اصغر کو جو گالیاں دی ہیں وہ بھی دیکھ لیں۔ خبیث۔ کمینہ۔ کم ظرف۔ شیطان علیہ اللعن کا شاگرد سب کچھ بنا دیا ہے (مضمون نمبر ۲ دیکھئے) یہ مداحان اصغر کی تہذیب ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اصغر کے موافقین اور مخالفین دونوں کے مضامین اس کتاب میں بطور سوال و جواب کے ہیں تو کوئی شخص کیسے یہ رائے قائم کر لے گا کہ اصغر کی ذاتی مخالفت کی بناء

یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اڈیٹر صاحب کے نزدیک سرکوب صاحب تو انسان نہیں ہیں لیکن مداحان اصغر انسان ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اس میں اصغر صاحب کا کچھ قصور نہیں ہے تو مخالفین اصغر کا بھی کچھ قصور نہیں ہے کیونکہ وہ اصغر صاحب سے کتاب بھر میں کہیں مخاطب نہیں ہیں بلکہ اُن کے مداحان سے مخاطب ہیں۔ اثر اس کا اصغر صاحب پر پڑے یا کسی اور پر وہ تو مداحان اصغر کی خبر لیتے ہیں مشکل تو یہ ہے کہ اگر انسانیت سے مداحان اصغر سے کہا جاتا تھا کہ بابا کسی شخص کی ایسی تعریف نہ کرو جو دوسرے کو ناگوار ہو تو بگڑ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اصغر کی تعریف ابھی ہوئی کہاں قیامت تک اگر تعریف ہوگی تب بھی ایک شتمہ انکی حدود ثنا کا بیان نہ ہو سکے گا۔ ایسا گروہ جو زبان اور محاورے کی غلطیوں کو اضافہ زبان سمجھے جو شعر کی خامیوں کو عمق خیال کرے جو غلط اور ناقص شعروں کی تادیل کرے اپنی سمجھ پر فخر کرے اور دنیا کو ناقابل اور نا فہم خیال کرے اس کی سرکوبی سوائے اس کے اور کسی طرح نہیں ہو سکتی تھی کہ اُن لوگوں کو چیلنج دیدیا جائے کہ اچھا اصغر کو میدان امتحان میں لائے تاکہ آپ کی سمجھ کا امتحان ہو جائے کہ جب آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اصغر کا شعر ہے اُس وقت آپ اُس کو پیغام خداوندی سمجھتے ہیں یا جب نہیں معلوم ہوتا اُس وقت بھی آپ اصغر کے شعر کی تعریف کرتے ہیں چنانچہ اصغر کی ایک غزل کے جواب میں جس کی تعریف میں علی گڑھ میگزین میں بہت مبالغہ کیا گیا تھا اُسی قسم کے اشعار بہت کم وقت میں کہہ کر ان کے مداحوں کے سامنے پیش بھی کر دئے گئے ہیں جو اُسی کتاب کے صفحہ ۳۵ و ۳۶ میں ہیں اصغر کی بجا تعریف کر کے عرش پر چڑھانے ہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اصغر کے دامغ میں یہ بات سما گئی کہ ہچومن دیگرے نیست، اور لطف یہ کہ اپنی قابلیت کے ثبوت میں اصغر صاحب صرف یہی بات پیش بھی کرتے ہیں کہ میری تعریف بڑے بڑے لوگ کرتے ہیں لیکن جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تعریف تو بہت سے وجوہ کی بنا پر ہو جاتی ہے آپ میں کچھ ذاتی جوہر بھی ہے یا نہیں تو اس کا جواب صرف خاموشی میں ملتا ہے۔ اصغر کا غرور اور مداحان اصغر کا جوش توڑنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کا راز شاعری فاش کر دیا جائے اس کو ذاتی مختصمت سے تعبیر کرنا ہٹ دھرمی ہے اگر کسی شخص کو اخلاقی سبق دیا جائے کہ ہر شخص کی اُسی قدر تعریف کرو جس کا وہ مستحق ہے اور دوسروں کی تذلیل کر کے دنیا کو رنج نہ پہنچاؤ تو آپ اس کو ذاتی مختصمت سمجھیں گے۔

اب رہی یہ بات کہ مداحان اصغر نے جو خلاف واقعہ ان کو بڑھایا اس کے جوابات ہو چکے تھے اسکی کیا ضرورت تھی کہ وہ سوال و جواب ایک کتاب کی صورت میں ایک جا کر دئے جائیں اس سے تو

یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اصغر کے ذلیل کرنے کے واسطے یہ کام کیا گیا اور اسی کو خصومت کہتے ہیں تو یہ اعتراض بھی وہی شخص کرے گا جس نے غور سے وہ پوری کتاب نہ پڑھی ہوگی جو شخص غور سے پڑھے گا اسکو مداحان اصغر کا کیرکڑ معلوم ہو جائے گا کہ واقعہ سے انکار کرنے میں ان کو کچھ باک نہیں ہوتا غلط بیانی اور دروغ گوئی میں شیر ہوتے ہیں۔ طالب علم نے جو یہ لکھا کہ مداحان اصغر باوجود چیلنج دینے کے کبھی اصغر صاحب کو میدان امتحان میں نہیں لائے اس کی نسبت ایک مداح نے جس نے اپنا نام راستگور لکھا ہے یہ لکھ دیا کہ یہ بالکل جھوٹ واقعہ ہے اور سراسر اصغر صاحب پر بہتان ہے (مضمون نمبر دیکھئے) یہ ظاہر ہے کہ کسی اخبار کے پرچے کوئی کہاں سے تلاش کر کے بروقت لاتا ہذا وہ مضامین اکٹھا کر دئے گئے تاکہ بروقت ضرورت پیش ہوا کریں۔ غرض یہ کہ اس کتاب کی ترتیب کا باعث بھی مداحان اصغر ہوئے اگر وہ غلط بیانی اپنا شیوہ نہ قرار دیتے تو کتاب بھی مرتب نہ ہوتی۔ سرکوب نے کتاب کے ترتیب کی غرض جو دیا ہے اس میں لکھی ہے اس کو بھی دیکھ لیجئے اس سے بھی اصغر صاحب کے ساتھ کوئی ذاتی خصومت نہیں پیدا ہوتی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامہ اصغر کو رد کرنے کی غرض سے کتاب مرتب ہوئی ہے میں اس کو یہاں لکھے بھی دیتا ہوں۔

”میں نے اس امید پر اس مجموعے کو مرتب کیا ہے کہ شاید مداحان اصغر کو یہ خیال آجائے کہ اب ہماری شرم و حیا کے چرچے ملک میں بہت زیادہ ہونے لگے لہذا اخباروں اور رسالوں کے صفحات کو الگ کر کے اپنی غیرت داری کا زیادہ ثبوت نہ دینا چاہئے۔“

غرض یہ ہے کہ سرکوب صاحب کو کوئی ذاتی مخالفت اصغر صاحب سے نہیں ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ مداحان اصغر کی بیجا سختیوں اور ترجیح بلا مرجح سے ان کو ایک قسم کی ضد ضرور پیدا ہوگئی ہے کہ ہم اصغر کے کل راز رفتہ رفتہ کھول دیں گے ابھی پہلا حصہ ہے دوسرے اور تیسرے حصہ میں اس سے زائد راز اصغر صاحب کے کھلیں گے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سرکوب کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر کی دل آزاری اور ان کے ذلیل کرنے کے لئے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس کا جواب تو یہی ہے کہ اصغر کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت چھوٹے آدمی ہیں پھر وہ کیوں اس قدر بڑھائے جاتے ہیں۔ بندہ پرور اس کتاب کے واسطے یہ نام نہیں ایجا دیا گیا بلکہ یہ ان کا بہت پُر انجھلص ہے اس کتاب کی ترتیب سے بہت قبل

ان کی نظمیں سرکوب کے نام سے اودھ پنچ وغیرہ میں موجود ہیں ایک شخص کے دو تخلص کوئی نئی بات نہیں ہے بہت لوگوں کے ایسے تخلص تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں کا تخلص شیفتہ بھی تھا اور حسرتی بھی اگر آپ کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ کہاں پر وہ سرکوب تخلص کرتے ہیں اور کہاں پر حامد۔

میری رائے میں اڈیٹر صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ اصغر صاحب سنجیدگی اور انسانیت کی وجہ سے چیلنج کو قبول کر کے میدان امتحان میں نہیں آتے اور ان کے نہ آنے سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے۔ میں یہی عرض کروں گا کہ یہ اڈیٹر صاحب کی نیک نفسی ہو ورنہ واقعہ یہی ہے کہ اصغر صاحب اپنی کمزوری کی وجہ سے میدان امتحان میں نہیں آتے اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ تو محض قیاس کی بنا پر کہتے ہیں اور جس شخص نے ان کی کمزوری اور شعر کہنے سے عاجز رہنے کا راز کھولا ہے اس نے تجربہ کیا ہے۔ تین برس تک اس کا اور اصغر صاحب کا ساتھ ایک ایسے ادبی کام میں رہا ہے جس میں شعر کہنے کی بھی ضرورت ہوتی تھی وہاں ہر انسانیت کو کام میں لانے کا کوئی سوال نہیں تھا کیونکہ نوکری کا معاملہ تھا لہذا اس کا تجربہ اڈیٹر صاحب کے قیاس سے کہیں زیادہ واقع ہے یہ زبردستی ہو کہ آپ اپنے قیاس کو کسی کے تجربے پر ترجیح دیں اور اگر اڈیٹر صاحب اس کو نہ مانیں گے تو ہم مجبوراً وہی عرض کریں گے جو مخالفین اصغر نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ جس شاعر کو اڈیٹر صاحب سنجیدہ انسان سمجھتے ہوں اس کو اسی قسم کے چیلنج دیکر دکھا دیں کہ وہ میدان امتحان میں نہیں آتا اور اپنی ناقابل برداشت بدنامیوں کے زہر کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتا ہے تو ہم مان لیں گے کہ اڈیٹر صاحب کی رائے صحیح ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اڈیٹر صاحب کی جرأت ہی نہ ہوگی کہ کسی مشاق شاعر کو وہ اس قسم کے چیلنج دیدیں اس سبب سے کہ ڈریں گے کہ وہ میدان امتحان میں آکر ان کو ذلیل کر دے گا۔ ایسی جرأت صرف اُسی شاعر کی نسبت ہو سکتی ہے جس کی کمزوری اور عاجزی کا یقین ہو اور یقین بغیر تجربے کے نہیں ہو سکتا چونکہ سرکوب صاحب کو تجربے سے یقین ہو گیا تھا اس وجہ سے مداحان اصغر کو چیلنج دئے گئے اور ان کے تجربے کو لوگوں نے صحیح مان لیا۔

کیا انسانیت کے خلاف یہ نہیں ہے کہ باکمال شاعروں کی اپنے مقابلہ میں توہین کرائی جائے لیکن اس سے اصغر صاحب کبھی نہیں جو کتے کبھی بحث کر کے ان سے دیکھئے کہ وہ اپنے مقابلہ میں کسی کو سمجھتے ہیں۔ جب تک گنجائش تھی اس وقت تک اصغر صاحب پر جو اعتراضات ہوتے تھے ان کے

جواب لکھنے میں انسانیت کو دخل نہیں دیا جاتا تھا اب جب سوائے اس کے اور کوئی گنجائش نہ رہی کہ اصغر میدانِ عمل میں لائے جائیں تو عصمت بی بی بے چارگی "ہو کر سب کے سب انسان بن گئے۔ اگر اڈیٹر صاحب کو کسی شخص کی بابتہ ذاتی تجربہ ہو جائے کہ وہ شعر کہنے سے عاجز ہے اور اس کے امتحان میں نہ آئیکا سبب لوگ اس کی انسانیت ظاہر کریں اس وقت تو اڈیٹر صاحب اس کی انسانیت کے قابل نہ ہونگے لیکن سرکوب صاحب پر یہ ظلم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کو کوئی چیز نہ سمجھیں اور اڈیٹر صاحب کے قیاس کو صحیح سمجھ کر اصغر کی انسانیت کے قائل ہو جائیں۔ اڈیٹر صاحب کے اصول کے مطابق تو ہر جاہل شخص اپنے عالم ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور اڈیٹر صاحب کو اس کو عالم ماننا پڑے گا اس سبب سے کہ جہل اور علم کا فیصلہ صرف امتحان کر سکتا ہے اور امتحان اڈیٹر صاحب کے نزدیک خلاف انسانیت ہے لہذا جاہل کو عالم ماننا انھیں واجب ہو جائے گا۔ اڈیٹر صاحب کوئی انسان خواہ ملک سیرت ہی کیوں نہ ہو کسی بات پر قدرت رکھتے ہوئے اس بات کے متعلق اپنی بدنامی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مضمون چونکہ طول ہو گیا ہے اس وجہ سے ہم اس بحث کے شواہد پیش کرتے ہوئے اس وقت اس لئے ڈرتے ہیں کہ اڈیٹر صاحب طوالت کا الزام رکھ کر مضمون کو واپس کر دیں گے لہذا اڈیٹر صاحب سے صرف اتنی استدعا کرتے ہیں کہ وہ کتاب کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیں۔ چھوٹی سی کتاب ہے تین گھنٹے سے زائد وقت ان کا نہیں خراب ہوگا اگر کتاب دیکھنے کے بعد بھی ان کی رائے یہی قائم رہے کہ اصغر انسانیت کی وجہ سے میدانِ عمل میں نہیں آتے تو دوسرے حصہ کا انتظار کریں جس میں اس کا پتہ دیا گیا ہے کہ اصغر کی کونسی غزل کس کی کہی ہوئی ہے اور اس کا ناقابل تردید ثبوت بھی ہے۔

بعض لوگ جن کے دماغ فونوگراف ہیں اصغر صاحب کے کہنے سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ سرکوب صاحب تخریبی کام کر رہے ہیں اور اصغر صاحب کے مداح تعمیری کام کرتے ہیں اگر تعمیری کام کے یہی معنی ہیں کہ دنیا کو دھوکا دیا جائے اور ایک شخص جو سیر بھر کا ہے وہ من بھر کا کر کے دکھایا جائے اور تخریبی کام یہ ہے کہ اُس دھوکے سے لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے تو میری رائے میں دنیا کو تخریبی ہی کام کرنا چاہئے۔ تخریبی کام تو یہ ہے کہ کسی اچھے کام میں خرابی ڈالی جائے اس کو کوئی انصاف پسند اچھا کام نہیں کہہ سکتا کہ واقعہ کے خلاف کوئی شخص بڑھایا جائے اور دوسرے باکمال حضرات اُس کے مقابلے میں گھٹائے جائیں۔ بعض آدمی جو یہ کہتے ہیں کہ اگر اصغر اپنے دوستوں کے ذریعہ سے بڑھاتے ہیں تو اپنے

کو آپ بھی بڑھائے یہ کیا ضرورت ہے کہ آپ ان کو گھٹا کر آپس میں رنجش پیدا کیجئے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون سی اخلاقی تعلیم ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کو دھوکا دیتا ہے تو آپ اس کے دھوکے کو کیوں طشت ازبام کرتے ہیں آپ بھی دنیا کو دھوکا دیجئے۔ مان لیجئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ایک شخص دوسروں سے غزل کہلا کر پڑھتا ہے تو کیا آپ اس کے اس راز کو فاش نہ کیجئے گا بلکہ خود بھی دوسروں سے غزل کہلا کر پڑھے گا اصل میں اس وقت جو اصغر صاحب کی بابت بحث ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ایک فریق تو ان کی شہرت پر جاتا ہے دوسرا فریق اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یہ تجربے کو تم غلط سمجھتے ہو تو اس کا امتحان کرلو آپ کہتے ہیں کہ امتحان انسانیت کے خلاف ہے پھر آخر فیصلہ ہو تو کیسے ہو۔ عجب زبردستی ہے کہ اپنے تجربے پر خاک ڈالو اور جو ہم کہتے ہیں اس کو بلا دلیل مانو۔

ہم اس کو مانتے ہیں کہ اڈیٹر صاحب کو یہ کتاب دیکھ کر تکلیف ہوئی ہوگی لیکن ان کو سرکوب صاحب کی بھی تکلیف کا احساس ہونا چاہئے کہ جس شخص کی قابلیت سے وہ واقف ہوں اس کی نسبت ایسے الفاظ دیکھ کہ وہ گزشتہ اور موجودہ شاعروں سے بہتر ہے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی اور اس تکلیف سے متاثر ہو کر اگر انھوں نے اصغر کا راز کھول دیا تو کیا گناہ کیا۔

اس وقت تک اس کتاب پر آٹھ دس اخباروں اور رسالوں میں میں نے ریویو دیکھے سوائے اڈیٹر نگار کے اور کسی کار ریویو میں نے اس کتاب کے خلاف نہیں دیکھا ممکن ہے جیسے انھوں نے بغیر کتاب کے دیکھے قیاس پر ریویو کر دیا ایسا ہی اور بھی کسی نے کیا ہو لیکن میری نظر سے نہیں گزرا غرض یہ کہ جن لوگوں نے کتاب کے اندر رہ کر رائے قائم کی ہے وہ اس کتاب کے خلاف نہیں ہوئے۔ ہر انصاف پسند کی یہ رائے ہے کہ اس کتاب نے اصغر کا راز افشا کر کے ملک پر احسان کیا ہے اور سچا نمائش کرنے والوں کا سد باب کر دیا ہے۔ ان مضامین کے کجا ہو جانے سے اصغر کی اصلی قابلیت ظاہر کر دینا ہر شخص کے لئے آسان ہو گیا ہے اور لوگوں کو اس کا سبق حاصل ہو گیا ہے کہ کسی شخص کی تعریف کرنے میں اس کو حد سے زیادہ نہ بڑھانا چاہئے۔

سرکوب صاحب خود انسان ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ تو اڈیٹر صاحب کو ماننا پڑے گا کہ انھوں نے مداحان اصغر کو انسان بنا دیا اس سبب سے کہ جب سے کتاب نکلی ہے اصغر صاحب کی مداحی بند ہو گئی ہے اور اس کی اُمید نہیں ہے کہ کتاب کو دیکھ کر کوئی غیرت دار اصغر کی ایسی مداحی کرے جس میں

استادان گزشتہ یا موجودہ کی توہین و تذلیل ہو اور یہی مقصد اُس کے مرتب کرنے کا تھا کہ مداحان اصغر انسان بن جائیں معلوم نہیں اڈیٹر صاحب کس کو اچھا سمجھتے ہیں انسان کو یا انسان گر کو۔ جیسا متعلم ہوتا ہے معلم ویسی ہی تعلیم دیتا ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مداحان اصغر پر انسانیت کا اثر نہیں ہوتا تو غیر انسان بن کر انھوں نے سب کو انسان بنا دیا۔ ہر کام کے نتیجہ پر غور کرنا چاہئے سر کو ب صاحب کو جیسی اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے شاید ہی کسی کو ہو کہ ہنگامہ اصغر کو انھوں نے فرد کر دیا اور مداحان اصغر کی زبان بند ہو گئی۔

(نگار) اس طویل مراسلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

- (۱) سر کو ب الہ آبادی نے اپنی کتاب جو "اصغر گوئدوی کی شاعری" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اصغر پر کوئی حملہ نہیں کیا بلکہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو ان کی حمایت میں دوسرے شعراء کو برا کہتے ہیں۔
- (۲) اصغر صاحب واقعی شاعر نہیں ہیں یا یہ کہ اگر ہیں تو بہت کم مشق۔
- (۳) سر کو ب صاحب بہت بے نیاز شخص ہیں اور باوجود بہترین شاعر ہونے کے وہ اپنے آپ کو شاعر کہلانا پسند نہیں کرتے، اس لئے انھیں اصغر صاحب سے کیا عناد ہو سکتا ہے۔
- یہ بالکل صحیح ہے کہ پہلے میں نے اس کتاب کو بالاستیعاب نہیں پڑھا تھا لیکن دوبارہ جب اسلہ نگار صاحب کے اصرار پر میں نے اسے پڑھ لیا، تو بھی کسی دوسرے نتیجہ پر نہیں پہنچا۔
- اگر معاملہ صرف اصغر کے مداحوں کا تھا (جیسا کہ مراسلہ نگار صاحب لکھتے ہیں) تو پھر اصغر صاحب اور ان کی شاعری کو درمیان لانے کی کیا ضرورت تھی، لیکن چونکہ اصل مقصود تو یہی ظاہر کرنا تھا کہ اصغر کو شعر کہنا نہیں آتا، اس لئے تمام مباحث سے نتیجہ یہی ایک نکالا گیا ہے۔ پھر مجھے اس اتفاق نہیں کہ اصغر صاحب اگر شعر اچھا نہیں کہتے تو خواہ مخواہ ان کی شاعری کو سراہا جائے، میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ مداحان اصغر، اپنے مدوح کو اچھالنے کے لئے دوسروں کی توہین و تذلیل کریں اور یقیناً میرے نزدیک یہ امر بھی پسندیدہ نہیں کہ اصغر صاحب (اگر وہ واقعی شاعر نہیں ہیں) اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے پر اصرار کریں۔ لیکن یہ تمام باتیں اس کو کیونکر مستلزم ہو سکتی ہیں کہ اصغر کی شاعری کے سلسلہ میں اصغر کی ذات کو سامنے لایا جائے۔

اس سلسلہ میں سرکوب یا کوئی اور نقاد یہ کہہ سکتا ہے کہ جب بحث یہ آن پڑے گی کہ اصغر شعر کہنا جانتے ہیں یا نہیں تو لامحالہ ان کی ذات اس میں شامل ہو جائے گی۔ یہ توجہ بہ بالکل درست ہے لیکن مجھے گفتگو اسی میں ہے کہ اول تو اس بحث کے اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر ہو تو اسکے لئے کوئی قوی دلیل موجود ہونا چاہئے۔ چیلنج قبول نہ کرنا، یا مشاعرہ میں سب کے سامنے غزل نہ کہہ سکرنا یا طرح پر غزل کہنے میں پس و پیش کرنا، یہ ایسے دلائل نہیں ہیں کہ اصغر کے غیر شاعر ہونے کے ثبوت میں کوئی وزن رکھ سکیں۔

ایک شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر وقت ہر شخص کی فرمائش یا ہر طرح پر شعر کہنے کے لئے تیار ہو جائے، بلکہ میرے نزدیک ایک حقیقی شاعر کبھی اس کی پابندی کر ہی نہیں سکتا، اور جو لوگ اس ”وے برندش“ قسم کی شاعری پر قدرت رکھتے ہیں وہ اکتسابی شاعر ہیں اور زیادہ سے زیادہ انھیں ”مشاعر“ کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے اصغر کے خلاف اس نوع کے دلائل پیش کرنا، میرے نزدیک انکی شاعرانہ اہلیت کو اور زیادہ مستحکم کرنا ہے نہ یہ کہ انھیں ان کے شاعر نہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جائے یہ ہو سکتا ہے کہ اصغر پر گو شاعر نہ ہوں اور ان کا دماغ بہت کم شاعری کی طرف متوجہ ہوتا ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ جس وقت ان پر شاعرانہ کیفیت طاری ہوتی ہے (خواہ وہ سال میں ایک ہی بار کیوں نہ ہو) تو شعر کیسا کہتے ہیں۔ اور اس صورت میں زیادہ سے زیادہ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ صرف ان کے کلام پر رائے زنی کریں نہ یہ کہ سرے سے ان کے شاعر ہونے ہی کا انکار کر دیں۔ اگر سرکوب صاحب کے پاس کوئی ثبوت اس امر کا ہوتا کہ اصغر نے اس وقت تک جو کچھ کہا ہے وہ فلاں شخص کی فکر کا نتیجہ ہے تو بیشک دوسری بات تھی، لیکن محض چیلنج یا طرح وغیرہ کے جھگڑوں کو سامنے لا کر ایسا حکم لگانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

اصغر صاحب کا کلام اس وقت تک جتنا شائع ہو چکا ہے اس کے دیکھنے کے بعد ایک شخص حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ شاعر پیدا ہوئے ہیں اور جب وہ کوئی شعر کہتے ہیں تو کسی خاص جذبہ سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ کسی شخص کا شاعر پیدا ہونا یا جذبات سے متاثر ہو کر کوئی شعر کہنا اس کو ضروری نہیں قرار دیا کہ جب وہ کوئی شعر کہے تو اچھا بھی ہو اور اس میں کوئی غلطی نہ پائی جائے، اسلئے بحث کا دائرہ محدود ہو کر صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ اصغر کا کلام کیسا ہے اور اس پر اگر دیانت دارانہ تنقید کی جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔

میں اصغر کی شاعری کے متعلق ایک سے زائد بار اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں اس لئے اس کے تکرار کی ضرورت نہیں، لیکن مجملہ و مختصر سلسلہ سخن میں اس موقع پر بھی اتنا ظاہر کر دینا ہے محل نہ ہو گا کہ اصغر صاحب جذباتی شاعر ہیں، فطرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لیکر آئے ہیں، اور جب اپنے تاثرات ظاہر کرنے کے لئے ان کو موزوں الفاظ مل جاتے ہیں تو بے مثل شعر کہہ جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ اسمیں کامیاب نہیں ہوتے تو شعر بھی ناقص رہ جاتا ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اصغر صاحب کے خلاف یہ ہنگامہ زیادہ تر مذہبی اختلافات کی بناء پر ہے یعنی سرکوب صاحب چونکہ شیعہ پارٹی کے سردار ہیں اس لئے وہ اصغر صاحب کی مخالفت کرتے ہیں جنہوں نے الہ آباد پونچر ایک جماعت شیعوں کی سنیوں کے خلاف فراہم کر لی ہے۔ میں اس باب میں سوائے اظہار افسوس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرے نزدیک ایک انسان کا بدترین جذبہ یہی ہے کہ وہ اختلاف مذہب کی بناء پر دوسرے انسان کا دشمن ہو جائے اور اگر اس میں کچھ بھی شائبہ صحت ہے تو میں سرکوب صاحب سے تو نہیں، کیونکہ مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں ہے لیکن اصغر صاحب کی بارگاہ میں ضرور عرض کروں گا کہ وہ اپنی انسانیت کو اس نوع کے ذلیل و رکیک جذبہ سے مجروح نہ کریں کیونکہ ایک حقیقی شاعر کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ حقیقی معنی میں انسان بھی ہو اور انسانیت کا اقتضا یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اختلاف مذہب کی بناء پر کسی کی مخالفت کرے۔

اگر شیعہ جماعت کی طرف سے واقعی کوئی زیادتی ہو، تو بھی اصغر صاحب کو انتقام کی پست سطح پر اتر آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ توصوفی منش انسان ہیں اس لئے ان سے زیادہ اس رمز کو کون سمجھ سکتا ہے کہ:۔
خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زبستن
حیف کافر مردن و آدخ مسلمان زبستن

دو ادبی شاہکار

شونہار۔ فلسفہ شونہار پر ایک ہمیل تبصرہ (علاوہ محصول)
ثنوی زہر عشق۔ مجلد مع رنگین تصاویر تین مقدمات قیمت (علاوہ محصول)
نیچر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

ایک ادبی بحث

کچھ عرصہ ہوا جناب درو شاہ جہا پوری نے اپنی حسب ذیل غزل اشاعت کے لئے میرے پاس بھیجی :-

اُف کہ بربادی دل جی سے بھلاتے ہی بنی
یاد اب تک ہے وہ نیرنگ بنوں کا عالم
ہائے اس چشمِ ندامت کے وہ خاموش گئے
تو بہ تھرا اٹھی جب سامنے ساتی آیا
رحم کو رحم نہ بھڑا اب دلِ مفہوم کا ذکر
آگیا فرق یہ کیوں آج تری فطرت میں
چنچ اٹھے، جب غم کو نین سے دونوں عالم
ہائے مجبور می دل یاد کوئی جب آیا
پردہ گل سے کیا کس نے تقاضا نظر
یاد جب آئی وہ کھوئی ہوئی دنیا قفس

پھر تری انجمن ناز میں آتے ہی بنی
ہر قدم پر سر پر جوش جھکاتے ہی بنی
شکوہ جو ردِ ستم دل سے بھلاتے ہی بنی
بادہ پیتے ہی بنی حجام اٹھاتے ہی بنی
اُف وہ بستی جسے ویرانہ بناتے ہی بنی
وقت حیرت تجھے کیوں سامنے آتے ہی بنی
کچھ سمجھ کر ہیں یہ بار اٹھاتے ہی بنی
نالہ کرتے ہی بنی اشک بہاتے ہی بنی
دہجیاں جیب دگریباں کی اڑاتے ہی بنی
آگ گھبرا کے نشیمن کو لگاتے ہی بنی

ہر خلش میں تھا کچھ اس رنگ اس در و سکوں

آرزو ستمِ دل کو بناتے ہی بنی

میں نے ان کو جواب میں لکھا کہ غزل خوب ہے لیکن ردیف کا اقتضاء یہ ہے کہ مفعول ہر جگہ موند ہو

اور آپ نے مونث و مذکر دونوں اس ردیف کے ساتھ استعمال کیے ہیں اس لئے مطلع کیجئے کہ اساتذہ کا طرز عمل کیا رہا ہے۔

درد صاحب نے جواب میں داغ کی ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں واقعی تذکر و تائید کی کوئی تفریق نہ تھی، میں نے پھر لکھا کہ دل صاحب سے دریافت کیجئے کہ اساتذہ لکھنؤ نے اس کی پابندی کی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب درد صاحب کی طرف سے یہ ملا:-

محترمی۔

سلام مستنون۔ تاخیر جواب کا باعث میری علالت تھی جناب کا استفسار قبلہ دل صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ فرماتے ہیں کہ ”مصدر کی علامت یا اے معروف سے بدکر فصحائے دہلی بولتے ہیں اور مصدر کو بجائے فعل استعمال کرتے ہیں جیسے مٹھائی کھانی تھی لیکن فصحائے لکھنؤ کہتے ہیں کہ مصدر اسم مذکر ہے اور کوئی اسم مذکر یا اے تائید کی تصریف قبول نہیں کرتا اس لئے مٹھائی کھانا لکھنا چاہئے لیکن فصحائے لکھنؤ کے کلام میں اکثر مثالیں اس کلیہ کے خلاف ملتی ہیں۔“

ناتخ۔ اگر دہلیز چھونے کی تجھے تعزیر دینی تھی ہمارے ہاتھ بندھوا اپنے دروازے کے بازو سے
اتیر۔ آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے چلے چمن میں نرگس بیمار ہو گئی ہے
جلال۔ جب اٹھ کے جاتے کہ دم توڑتے دم نزع جو ہوئی تھی وہ تمھارے ہی روبرو ہوتی
حضرت داغ کا یہ شعر

ذلت عشق ہے وہاں عزت شکوہ آبرو کے نہ بنی

یہاں نہ بنی کے ساتھ بات مقدرومانی جاسکتی ہے مگر

”جب رکاخون بسنگی دم پر چاکب دل کو ر فوکے نہ بنی“

میں مصرعہ ادلی کے ساتھ کوئی لفظ مقدر نہیں سمجھا جاسکتا۔ میری رائے میں یہ مسئلہ زبان سے

متعلق ہے اور زبان کے لئے کوئی قاعدہ نہیں۔ تاہم میں حضرت نیاز کی قائلانہ رائے کو اپنی رائے

پر ترجیح دیتا ہوں۔ ”معلوم کر کے مجھے بھی بتانا، امید ہے کہ جناب رائے عالی سے

سرفراز فرمائیں گے۔“

میں نے اپنے پچھلے خط میں جناب سے دریافت کیا تھا کہ آپ موجودہ شعرا میں سے زیادہ کس کو پسند فرماتے ہیں غالباً گرامی نامہ تحریر فرماتے وقت آپ کو اس استفسار کا خیال نہیں رہا میں اعادہ کرتا ہوں تغزل میں تنوع خیال سے کیا مقصود ہے ہندی شاعری اس نقطہ نظر سے اُردو شاعری سے بہتر ہے یا کمزور۔ مسائل ذیل کو تغزل سے کیا تعلق ہے اور اگر نہیں ہے تو مستند شعرا کے کلام میں اس قسم کے اشعار کیوں ملتے ہیں۔

جبر و اختیار۔ بے ثباتی دنیا۔ انسان اور اس کی حقیقت۔ شکوہ فلک۔ شکوہ بے مہری زمانہ۔ بے دینا۔

حافظ کا دیوان اس قسم کے مسائل سے بھرا پڑا ہے مولانا شبلی "حیات حافظ" میں ان کو تنوع خیال کی مثالوں میں درج کرتے ہیں۔ اُردو شاعری میں بھی متقدمین سے لیکر متاخرین تک سب ہی اس پر کار بند نظر آتے ہیں برخلاف ان کے ہندی غزل میں مسائل دیکھنے میں نہیں آتے۔

مجھ پر جناب کی بڑی نوازش ہوگی اگر شرح و بسط کے ساتھ اس استفسار پر روشنی ڈالیں۔

نیاز کیش

درد

(نگار) اس خط کے پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر ضرور پہنچا کہ اس محل پر اہل دہلی و اہل لکھنؤ دونوں نے تذکیر و تائینت کے اختلاف سے اعتنا نہیں کیا ہے، لیکن مجھے اطمینان ابھی تک نہیں ہو سکا ہے اور اسلئے میں اساتذہ فن سے اپیل کرتا ہوں کہ اس باب میں وہ اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔

درد صاحب کے دیگر استفسارات کا جواب درج ذیل ہے:—

(۱) موجودہ غزلگو شعرا میں، حسرت موہانی سے زیادہ میں کسی کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) تغزل میں تنوع خیال کا تعلق صرف انھیں جذبات سے ہونا چاہئے جو عشق و محبت کی دنیا کے لئے مخصوص ہیں اور یقیناً ہندی شاعری اس لحاظ سے زیادہ دلکش ہے اُردو شعرا نے فلسفہ و تصوف وغیرہ

خدا جانے کیا کیا شامل کر کے غزل کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

جبر و اختیار، شکوہ زمانہ، بے ثباتی دنیا وغیرہ سب کی غزل میں کھپت ہو سکتی ہے، بشرط آنکہ دائرہ سخن وہی عشق و محبت ہو اور اس کی پوری پابندی اگر کسی نے کی ہے تو وہ صرف سعدی ہے۔ حافظ کا ذوق صرف رندانہ غزل گوئی ہے اور ایک بدست رند جوش و ولولہ میں سبھی کچھ کہہ جاتا ہے، لیکن اس کو معیاری تغزل نہیں کہہ سکتے۔

اُردو فارسی شاعری کا فرق اس باب میں یہ ہے کہ فارسی زبان کی شیرینی و وسعت ہر مسئلہ کو کسی ذکسی طرح کھینچ کر عشق و محبت سے ملا سکتی ہے اور اُردو میں اس کی گنجائش نہیں۔

بہار

مولفہ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ منصف سہارنپور

”گلدستہ بہار“ فارسی اور اُردو شعرا کے چوٹی کے کلام کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے کسی کے دیوان کی ضرورت نہیں ہے چیدہ چیدہ متحد المضمین اشعار ایک خاص سرخی کے تحت میں درج ہیں بزخیال سیکڑوں ہیں۔ علم و ادب میں گلدستہ بہار ایک دکنش اور دلغریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے مصرع شنیدہ کے بودمانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ ضخامت ۴۳۴ صفحے۔ قیمت مع محصول ڈاک ۸ روپے۔

منیجر صاحب دارالین اعظم گڑھ

تذکرہ معرکہ سخن شائع ہو گیا

یہ تذکرہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانہ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعرا فارسی و اُردو و مثلاً آتش، آرزو، آزاد بلگرامی، احسن مارہروی، اصغر گوندوی، ڈاکٹر اقبال، امیر انیس، بخود، جگر، حنین، خواجہ کرمانی، دبیر، ریاض، سودا، شرر، صائب، صفی، عالی شیرازی، عزیز لکھنوی، غالب، میر، و ناسخ وغیرہ وغیرہ کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں مع جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں فن شعر و انشاء کے شایقین کے لئے عجب چیز ہے۔ قیمت مع محصول ۸ روپے۔

منیجر نگار لکھنؤ

نور و نار

گزارش :-

پیارے میرے خلوص بھرے آنسوؤں کا نور
 پہونچا ہے دور کے کسی روشن دیار میں
 جس سرزمین کو زہرہ و ناہید ہیں رداں
 اُس سرزمین سے آئی ہے تو میرے دس میں
 آئی ہے تاکہ ٹھہرے یہاں رات کے لئے
 گو تو ہے ایک پیکر محسوس جانِ من
 لیکن ترا وجود طلسم خیال ہے
 آنکھیں تری بنی ہیں فرشتوں کے زہرے سے
 میرے جنوں کا راگ، مرے عشق کا سرور
 حسنِ ازل کے دائمی فردوس زار میں
 جا کر جہاں ٹھہرتے ہیں تاروں کے کاراں
 موسیقیوں کی روحِ عورت کے بھیس میں
 میرے غریب دل کی مدارات کے لئے
 آنکھیں ہیں تیرے حسن سے مانوس جانِ من
 تخلیقِ رنگ و نور کی حدِ کمال ہے

اے کہکشاں سے اُترتی ہوئی پاک نازنیں
 جا! میرے غمکدے میں نہیں کچھ بجز الم
 جا اپنے رنگ و نور سے معمور گھر میں جا
 ہیں تیرے انتظار میں اُس دس کے کیں
 ہے میری کائنات محبت کا تلخ غم
 اس غمکدے سے دور "مسرت نگر" میں جا

جواب :-

اے اُلفت و نیاز کے پابند نوجوان
 بہتر ہے ارضِ نور سے یہ تیرا خاکداں

میرے وطن میں عشرتِ جاوید ہے مکیں بے شک جمالِ زہرہ و ناہید ہے مکیں
میرے وطن میں نور کے چشمے بھی ہیں رواں

بے فائدہ گردہ ”بیابانِ نور“ ہے اُس نورِ زار میں مرادِ غم سے چور ہے
اُگتا گئی ہوں نور سے ہے نار کی تلاش جذباتِ آتشیں کے پیشِ زار کی تلاش
تیری جنوں نواز نگا ہیں عجیب ہیں، ڈوبی ہوئی گداز میں آہیں عجیب ہیں
آئی ہوں تیری چاہ میں کتنی دور سے برباد کر نہ مجھ کو عبث ذکرِ نور سے

آغوشِ اشتیاق میں اس طرح لے مجھے
بس اپنے دل کی آگ سے تو پھونک دے مجھے

عدم

مجموعہ فسادِ جواہر

جماران

کے مضامین کی فہرست آپ کو اس رسالہ کے اخیر میں ملیگی اس کو ملاحظہ فرما کر فیصلہ کیجئے کہ آیا ایسا ناور ذخیرہ معلومات جو ۵۱۲ صفحات کو محیط ہے چچا میں گراں کہا جاسکتا ہے۔ آپ نے اگر اب تک اس کو نہیں دیکھا تو اب طلب فرمائیے اور اپنے احباب کو بھی متوجہ کیجئے۔ نیچر ہنگار لکھنؤ

نیاز فتحپوری کے ۳۲ ادبی شاہکار اور افسانے جو اسی سال شائع ہوئے ہیں، اور ۵۵ صفحات پر محیط ہیں۔ پہلے ادیشن کی جلدیں بہت کم رہ گئی ہیں۔ اگر آپ نے اس وقت تک اپنی لائبریری کے لئے طلب نہیں فرمایا تو اب یہی قیمت مجلد للہ غیر مجلد للہ علاوہ محصول نیچر ہنگار

حضرت محشر عابدی کے ان مختصر افسانوں کا مجموعہ جو مختلف رسائل میں شائع ہو کر پبلک سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ قیمت مجلد عا غیر مجلد عا علاوہ محصول نیچر ہنگار لکھنؤ

محشرستان

فراق

مگر مجھے تری قسم

ہنوز تجھے دور ہوں

مرے نیاز عشق سے بسا ہے آستانِ ترا
مری شمیم شوق سے کھلا ہے گلستاںِ ترا
ہر اک خواب ہے مرا اگرچہ رازداںِ ترا

جنوں فشانیاں مری

ترے قریب ہیں بہت

بہت کہانیاں مری

تجھے حبیب ہیں بہت

مگر مجھے تری قسم

ہنوز تجھے دور ہوں

اگرچہ جذب عشق سے

جہاں ہے تو وہاں ہوں نہیں

نہاں ہوں کائنات سے

ترے لئے عیاں ہوں میں

تو نور ہے میں طور ہوں

تو راز ہے بیاں ہوں میں

مری طواف گاہ ہے ہر ایک رگنذر تری

وہیں گیا ہے دل مرا جہاں گئی نظر تری

مگر مجھے تری قسم

ہنوز تجھے دور ہوں

حدود کا نشان ہو کیوں

سجود گاہِ عام — میں

مغائرت کا ذکر کیا

حلیقۃ السلام میں

کچھ امتیاز ”ماؤ تو“

نہیں ہے اس نظام میں

حریم ناز دوست میں کچھ احتساب ہی نہیں

جہاں حبیب ہے وہاں کوئی حجاب ہی نہیں

مگر مجھے تری قسم

ہنوز تجھے دور ہوں

تصورات کے خدا

تصورات میں ہے تو!

تخیلات کی دعا

تخیلات میں ہے تو!

مری حیات تجھے ہے

مری حیات میں ہے تو

مرے ہر اک خواب میں ترا خیال ہی تو ہے

مرے ہر اک خیال میں ترا وصال ہی تو ہے

مگر مجھے تری قسم

ہنوز تجھے دور ہوں

روشِ صدیقی

فردوس خیال

آسماں رات کوتاروں سے بھرا ہوتا ہے ہاں جب ایسے میں کوئی نغمہ سرا ہوتا ہے
 میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں
 چاندنی رات میں جب مست ہوا چلتی ہو جیسے نیکھا کوئی مخمور پری جھپکتی ہے
 میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں
 گرمیوں کی شب پر کیف کے سناٹے میں گل فروشوں کی جب آتی ہیں حسیں آوازیں
 میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں
 فصلِ باراں میں جب آتی ہو گھٹا گھر گھر کے اور جذبات ابھرتے ہیں دلِ کافر کے
 میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں
 جب گلی میں کوئی درویش صدا کرتا ہے خوش رہو میرے میاں! سائیں دُعا کرتا ہے
 میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں
 راہ میں جب کوئی دوشیزہ نظر آتی ہے اور بوزلف کی چلتے میں سنگھا جاتی ہے
 میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں
 کوئی کہتا ہے جب افسانہ حُسن و اُلفت کھولتا ہے درمیانہ حُسن و اُلفت
 میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں
 یاد جب آتے ہیں عیش و غم اُلفت کے دن ہائے وہ عشق کی پُر لطف اذیت کے دن
 میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں
 دل کے ارمان ہوا کرتے ہیں جب زیر غور دل تو جذبات کی شدت سے دھڑکتا ہے اور
 میں کسی دوسری دنیا میں چلا جاتا ہوں

اعتراف شکست

مجھے اعتراف شکست ہے
نہ خدا کے واسطے چھیڑا ہے

تری ہر نگاہ بلا اثر
مرے دل پہ اب بھی ہو حکمراں
تری ہر ادا سے جمیل کا
تو دل سے اب بھی ہوں قدراں
ترا ہر تبسم دلربا
مرے واسطے اب بھی ہو جانتاں

گرا سے جیسے دھو برہ
نہ وہ میں ہوں اور نہ وہ آرزو
نہ وہ شوق ہے، نہ وہ جستجو

نہ خدا کے واسطے چھیڑا ہے

مجھے اعتراف شکست ہے

پیشی نقوی

نہ حریف لذت غم ہوا
نہ خموش رہ کے جفا سہی
نہ رہیں در و دالم ہوا
نہ ستم ہے، نہ بلا سہی
نہ وفا کا پاس کیا ذرا
نہ ملامت رفقا سہی

یہی تنگ عشق میں کم ہو کیا؟

یہ ادائے لطف و کرم ہو کیا؟

یہ جدید طرزِ ستم ہو کیا؟

نہ خدا کے واسطے چھیڑا ہے

مجھے اعتراف شکست ہے

ترکی جمہوریہ | انقلاب ترکی کی بے مثل تاریخ۔ ایک زندہ قوم کی جدوجہد کی سبق آموز داستان
مصنفہ ضمیر احمد ہاشمی۔ ام۔ اے۔ قیمت پندرہ علاوہ محصول۔ - بیچر نگار لکھنؤ

عورت سے خطاب

ایک مشت خاک کو جب ملگیا حسن و شباب
نور کے سانچے میں ڈھل کر آئی تصویر بہار
اے کمال صنفِ نازک اے محبت کی پری
تو بہشتی حور تھی اب با وفا عورت بنی
آسمانِ آرزو کا تو کوئی ستیارہ ہے
تیری آمد سے ہوا قائم محبت کا نظام
تو دلوں کے واسطے لائی ہے صہبائے حیات
تیری آنکھوں سے عیاں ہے ایک طعنانِ شباب
تیرے جلووں کی نائش منظرِ جوشِ جمال
تو وہ قوت ہے نہیں جسکی ہے کوئی انتہا
کہربائی قوتوں سے کام جب لیتی ہے تو
شعر و موسیقی کے نغمے ہیں تری آوازیں
مرد کی مونس ہے تو اور ہمد و دمساز ہے
عیش کی تصویر تو ہے رو کلفت کے لئے

ساغر گل میں نظر آئی محبت کی شراب
اب نظر آنے لگی آغوشِ آدم کا نگار
تیرے جلوے عیش پرور تو ہے جنت کی پری
روح کی پاکیزگی سے پیکر عصمت بنی
تو شہابِ سن ہے یا دلربا مہ پارہ ہے
ورنہ رہ جاتی یونہی تکوین عالمِ ناقص
موجزن تیرے اشاروں پر جو دریائے حیات
شعلہ سینا ہے تجھ میں تو ہے جنت کا جواب
معجزہ قدرت کا ترکیب عناصر کا کمال
تو ہے اسی انتہا جس کی نہیں ہے ابتدا
سنگدل کو مسکرا کر موم کر دیتی ہے تو
اک جہانِ دلکشی ہے تیرے ہر انداز میں
اور تکوین جہاں کا تو مقدس راز ہے
ہے محبت تیرے دم سے تو محبت کے لئے

آسمانِ عشق کا تو خوشنما ہوتا ہے
تو سراپا ذوق انسانی کا دلکش خواب ہے

بہی کے ساحل پر

کارواں درکارواں رنگینیاں
 حُسن کی رعنائیوں کا ازوہام
 جلوہ فطرت کی لالہ کاریاں
 ہلکی ہلکی وہ گلابی ساریاں!
 وہ شلو کے جامدانی، نیلگوں!
 وہ نگاہیں وہ تڑپتی بجلیاں!
 ہلکا ہلکا سا تبسم زیر لب
 قامتِ نازک میں ہلکی سی لچک
 وہ تمناؤں کے پیکر دِلنواز!
 سیکدہ درمیکدہ کیفِ شراب
 چاندنی کی نرہمتیں زیرِ نقاب
 شاہدِ معنی کا شیریں سچ و تاب
 ریشمی زرتار پلو برقتاب
 اُن سے وہ چھتا ہوا رنگِ شہاب!
 اور وہ شاداب چہرہ وہ شباب!
 حُسن کی گستاخیاں وہ بے حجاب!
 نرم رومجوں میں جیسے سچ و تاب
 ”زندگی ہے یا سکون آمیز خواب“

شام کی رنگینیاں ہیں بشمار
 حُسن و اُلفت کا اعادہ ہو چکا
 چھپ رہا ہے رفتہ رفتہ آفتاب
 مانگ لے کچھ اے دلِ حسرت مآب
 بہی کے ساحلوں کو اے شمیم
 اک نظر ہی دیکھ لینا ہے ثواب

شمیم نعمانی نیازی

انقلاب

”خود فراموشی“ بدل کر ”خود نما“ ہو جائیگی
آتشیں بادِ مخالفت جانفزا ہو جائیگی
مشکل حالات خود ”مشکل کشا“ ہو جائیگی
”تیرگی“ مٹ کر ”جہاندار ضیا“ ہو جائیگی
چار سو شانِ ترقی رونما ہو جائیگی!
روحِ مذہب - دیکھنا ہے آسرا ہو جائیگی
حکمرانی زہر - دولت ”سکھیا“ ہو جائیگی
”شامِ غربت“ صبحِ عیش جانفزا ہو جائیگی!

چل چکا ہے خواب ہستی پر فسوں انقلاب
بڑھ رہا ہے شعلہ مغربِ بداماں صد خروش
ڈال دی جائیگی پائے غم میں زنجیر شکست
روند ڈالا جائیگا اقبالِ ظلمت پاؤں سے
سر کو ٹکرائیگا دیواروں سے ”دورِ انحطاط“
ٹوٹ جائیگا جہادِ قومیت کا سلسلہ
ٹھوکر میں کھائیگا پھر سرمایہ دار جیلہ گر
زندگی کی کشمکش سے ہو گی تکمیل وجود

خود بخود فطرت پہ تب گویا شباب آجائگا

کروٹیں لیتا ہوا پھر ”انقلاب“ آجائگا

دیکھنا اڑ جائیگی مذہب پرستی ایک دن
لوگ سمجھیں گے اسے ظلمت پرستی ایک دن
دولتِ اسلاف ہو جائیگی سستی ایک دن؟
یا سراپا برق بن جائیگی ہستی ایک دن

اختلاطِ مشرق و مغرب میں وقفہ تاج کے
حورِ جنت اور انساں کے تقدس کا خیال
عقل پست و فہم پست، انساں کا سوز و مساز پست
برق کی ہلکی سی رو اس کا جلا دیگی کبھی

ہے اسیدم جستجوئے ”تازہ ویرانی“ مجھے
عرش کے تارے دکھا دے میری حیرانی مجھے

شمیمِ نغانی نیازی

جنوری ۳۵ء کیلئے

حسب ذیل عنوانات پر مقالے درکار ہیں

- (۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر روزانہ نظر اور انکی خصوصیات
 - (۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج
 - (۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ
 - (۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر
 - (۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر
 - (۶) دونوں اسکولوں کی غزل گوئی پر تفصیلی تبصرہ
 - (۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
 - (۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
 - (۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں
 - (۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں
 - (۱۱) دکن اور اردو شاعری (اس وقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
 - (۱۲) پنجاب اور اردو شاعری (اس وقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
 - (۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کی خدمات
 - (۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے رباعیات مرثیہ قصیدہ و نعت میں
 - (۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر
 - (۱۶) شبابان اودیسہ اور لکھنؤ کی شاعری
 - (۱۷) دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر
 - (۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دور و زریں
 - (۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور و زریں
- نوٹ :- لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعرا ہیں جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔
- (۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے دہلی کا قیام کیا
 - (۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا قیام کیا
 - (۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعراء جنہوں نے ملک قوم کو کوئی خاص کام پایا
 - (۲۳) کیا دہلی اسکول رو بہ انحطاط ہے؟ اور کیوں
 - (۲۴) کیا لکھنؤ اسکول رو بہ انحطاط ہے؟ اور کیوں
 - (۲۵) رامپور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے
 - (۲۶) حیدر آباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق
 - (۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟
 - (۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو کیا
 - (۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو کیا
 - (۳۰) مستقبل میں آپ کو اردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟
 - (۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعراء جنہوں نے قدامت کو ترک کر کے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا
 - (۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے رنجی اور ہزل گو
 - (۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنہوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا۔
 - (۳۴) لکھنؤ اسکول کے غزلت ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
 - (۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
 - (۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

فہرست مضامین مجموعہ تنفسا و جواب

(۱) غوازی مصر حیشیون۔ اخوان الصفا (۲) گریہ جنین (۳) قمری پہینے (۴) بوسہ (۵) اصطلاحات
تصوف کا ترجمہ (۶) ابوالعلاء المعری (۷) عبداللہ پاشا فکری (۸) تورجہاں کا ایک شعر (۹) فن کاغذ سازی (۱۰) عربی
بازار بردہ فروش (۱۱) نظام شمسی کا آفتاب (۱۲) اقسام عالم جبر و اختیار (۱۳) ہلالی پرچم (۱۴) سورج کا وقت طلوع
و غروب بڑا نظر آنا اور کم گرم ہونا (۱۵) بالشونیم (۱۶) باب و بہار (۱۷) نباتات کا تنفس (۱۸) جراحی اور مسلمان (۱۹) خواب
کی حقیقت اور تعویذ وغیرہ (۲۰) لفظ و رکاب بالتشدید استعمال (۲۱) دستوریت (۲۲) بندوق۔ بارود۔ محکمہ آبکاری (۲۳)
بحر مردہ (۲۴) نامہ برکبو تر (۲۵) یورپ کی وسیع ترین زبان (۲۶) سعد بن وقاص کا مزار (۲۷) معاد و خلو و طبیعات
کے زاویہ نگاہ سے (۲۸) اجراء اخبارات کی تاریخ (۲۹) عالم خیال اور رشک و رقابت (۳۰) خواتین ترکی اور تعلیم
(۳۱) نیستی سے ہستی کا امکان، درس نظامی کی تاریخ (۳۲) طبقہ نسواں اور غزل گوئی (۳۳) برج بابل (۳۴) طبقہ
فاسسٹ کی وجہ تسمیہ (۳۵) آفتاب کے داغ (۳۶) سامری کون بتا دے (۳۷) کیا بدوح خدا کا نام ہے (۳۸) نوٹ
کے اجراء کا فائدہ (۳۹) مہی کے پستہ قد محسوس ہونے کا سبب (۴۰) چند الفاظ کی تحقیق (۴۱) باغ ارم کی حقیقت (۴۲)
فلسفہ محبت (۴۳) یقینی کی وجہ تسمیہ (۴۴) سیم تشراف (۴۵) میقات حج (۴۶) ہندو کی حقیقت (۴۷) طبقہ متا ولہ (۴۸)
اصحاب کہف (۴۹) بھوت پریت (۵۰) فلسفہ اجتماع (۵۱) جان بل (۵۲) کس کا شعر ہے (۵۳) سال کیسہ حساب
گرگوری میں (۵۴) اندیا آفس لائبریری (۵۵) سالوشین آرمی (۵۶) بالہ کا سبب (۵۷) عین الزماں طرابلسی (۵۸)
تساوی سنہ ہجری و عیسوی (۵۹) کرامات غوث الاعظم (۶۰) حافظ شیرازی اور تیمور کی ملاقات (۶۱) چند افغان کے
منی (۶۲) طاعت و جزا کی تمنا (۶۳) داغ و امیر (۶۴) الپ ارسلان (۶۵) معجزہ و کرامات سے انکار (۶۶)
صدور محال کا امکان (۶۷) پردہ اور تعلیم نسواں (۶۸) مریخ کی حقیقت (۶۹) ایران کا صفوی خاندان اور
قاجاری حکومت (۷۰) مصور علاج (۷۱) آنکھ و رچال کی تشبیہ (۷۲) معجزہ و کرامات (۷۳) آنسہ می کا شعر مشور (۷۴)

گریہ معصوم (۷۵) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۷۶) ابوالعتاہیہ کے متعلق چند سوالات (۷۷) فرقہ معتزلہ کے مختلف فرقے (۷۸) ایک برہم مستفسر کے چند استفسارات (۷۹) کھدر، جن، تعویذ، اُردو لغت (۸۰) بت عالیہ مو (۸۱) اسمائے نجوم (۸۲) بروج اسماء کی حقیقت (۸۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۸۴) ہسپانیہ و آندلس (۸۵) حکومت مصر (۸۶) اسماعیلیہ مذہب (۸۷) اعداد متحابہ (۸۸) ادبیات (۸۹) ستاروں کی تعداد (۹۰) بوقلموں (۹۱) کلام مسیح (۹۲) علی محمد باب (۹۳) مذہب و عقل (۹۴) طوفان نوح (۹۵) دیباچہ کی اصلیت (۹۶) رامائن و مہا بھارت (۹۷) ابدالی اور درانی (۹۸) قلعہ گوالیار (۹۹) سید جلال (۱۰۰) خلفاء عباسیہ مصر (۱۰۱) بنو لا اور اجرام فلکی (۱۰۲) مرزا عبدالقادر بیدل (۱۰۳) منج فروش نیشاپور (۱۰۴) تشبیہات چشم (۱۰۵) عرب میں گودنے کا رواج (۱۰۶) دیبل کی جائے وقوع (۱۰۷) طبقہ نسواں اور تعلیم (۱۰۸) چند اصطلاحات کا ترجمہ (۱۰۹) شاعری کی بعض اصطلاحیں (۱۱۰) عربی میں تقسیم علوم (۱۱۱) حقیقت و مجاز (۱۱۲) عالم یقین و عالم جبروت (۱۱۳) چند اصطلاحات شاعری (۱۱۴) صلوات الوسطی (۱۱۵) ظفر کا غیر مطبوہ کلام (۱۱۶) اوزون فردوسی (۱۱۷) تانا شاہ (۱۱۸) تھیا سوفکل سوسائٹی (۱۱۹) نگہ چری (۱۲۰) فیروزہ حصار (۱۲۱) برہم سماج (۱۲۲) مستناپور (۱۲۳) اڑھائی دن کا جھوٹا (۱۲۴) ثنوی مولانا روم کا ایک شعر (۱۲۵) پرانا قلعہ و اتانگج لاہوری (۱۲۶) تغزل اور اصطلاح صوفیہ (۱۲۷) منصور علاج اور غرقابی فرعون (۱۲۸) بعض الفاظ کے معنی (۱۲۹) کس کا شعر ہے۔ (۱۳۰) کیکاؤس و کینخسرو (۱۳۱) ملا دو پیازہ کی قبر (۱۳۲) میر شیر علی افسوس (۱۳۳) کیا زیب النساء کے شعر ہیں (۱۳۴) فری میں کیا ہے (۱۳۵) الفت لیلہ (۱۳۶) شیخ بدر عالم شیخ بایزید (۱۳۷) زبان اُردو کی ابتداء، بہرا (۱۳۸) عشق محبت (۱۳۹) دوسرے کروں میں آثار حیات (۱۴۰) اسلام کے متفرق فرقے اور فرقہ معتزل (۱۴۱) انکل سام (۱۴۲) استعار کی شاعری (۱۴۳) امیر دوست محمد خاں (۱۴۴) حافظ کے دو شعر (۱۴۵) ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم (۱۴۶) فرقہ اسماعیلیہ (۱۴۷) ابن رشد و شیخ الرئيس (۱۴۸) ابوالفضل کی قبر اور غالب کا ایک شعر (۱۴۹) عرفی اور شاہزادہ سلیم (۱۵۰) زحل لارنس بتون (۱۵۱) عمر انسانی (۱۵۲) نسبتی تقائیسری (۱۵۳) عہد اسلام کے سکے (۱۵۴) سلطان (۱۵۵) ملکہ چین (۱۵۶) سورہ فاتحہ (۱۵۷) ہالہ اور مد و جزر (۱۵۸) مونٹ کارلو (۱۵۹) حالی کا ایک شعر (۱۶۰) نظریہ تکہرب (۱۶۱) انسولین (۱۶۲) اتقائے انسانی کی دوسری منزل (۱۶۳) قصر الحمراء (۱۶۴) بعض اصطلاحات کا ترجمہ (۱۶۵) ارسطو کا مدفن (۱۶۶) یاجوج ماجوج (۱۶۷) ثنوی کا ایک شعر (۱۶۸) ہندی اور عربی شاعری (۱۶۹) نیو پوٹنزم (۱۷۰) ہپڈل کے بعض اشعار (۱۷۱) ثنوی کا ایک شعر (۱۷۲) اپریل فول (۱۷۳) مشتری (۱۷۴) امریکہ کی دولت۔